۳۰۔ مرتد بغاوت میں کافر اصلی سے بڑھا ہوا ہے۔

قوانین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہیں بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں۔ ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہوجائے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں۔ یا احسان کرکے رہا کردیتے ہیں۔ یا عزت کے ساتھ نظر بند کردیتے ہیں۔ مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریائے شور کے کچھ سزا ہی نہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ رعایا بنکر باغی ہوجانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے اسی طرح اسلام لاکر مرتد ہوجانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اسکی تعلیم کو دوسروں کی نظروں میں حقیر کرنا ہے۔

دیکھئے ایک وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے اسکی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر کبھی وہ آپ کی مذمت و ہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی۔ سب کہدیتے ہیں کہ میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت ہے۔ دشمنی میں ایسی باتیں کرتا ہے اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کا دوست رہا۔ پھر کسی وقت مخالف بن گیا اسکی مخالفت سے بہت ضرر پہونچتا ہے۔ اور وہ جو کچھ برائیاں کرتا ہے لوگ ان پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ وہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا منشاء محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا معلوم ہوتا ہے کہ دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہوگئے ہیں اس لئے مخالف ہوگیا۔ حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو، وہ اترے پترے معلوم کرکے بعد ہی دشمن بنا ہو۔ ممکن ہے اس شخص نے دوستی ہی میں اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہوں گا اس کو یہ سمجھ کر قبول کرلیں گے کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہے۔ اس کو ضرور کچھ رازدار باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ اس لئے مخالف ہوگیا۔ چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ پس ہرچند دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر عادۃً لوگ دوستوں کی مخالفت سے عموماً جلد متاثر ہوجاتے ہیں اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے۔ اس لئے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے۔

اس لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

(محاسن الاسلام ص۱۹)

۳۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غنائے قلب کا حال۔

سمجھ لینا چاہیئے کہ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غنائے ظاہری کی ضرورت نہ تھی اور جو اصل غنا ہے یعنی غنائے قلب، تو وہ آپ کے پاس فطرت سے موجود تھی اور نبوت کے بعد اس میں اس قدر ترقی ہوئی کہ کسی کو بھی آپ کے برابر غنائے قلب حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس کا مدار توکل اور تعلق مع اللہ پر ہے اور ان صفات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی کامل نہیں اس لئے آپ کے غنائے قلب کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ بلکہ ظاہری غنا سے تو اہل قلب کو پریشانی ہوتی ہے اور اس کے حقوق کا خیال کرکے یہ پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اسی کے ازالہ کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کو فرمایا ہے۔ هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ اس کی دو سری تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ "ہٰذا" مبتدا "عطاؤنا" خبر اول "بغیر حساب" خبر ثانی، یہ ہماری عطا ہے اور بے حساب یعنی بے شمار "بغیر حساب" سے کثرت کا بتلانا مقصود ہے۔ اور ایک تفسیر یہ ہے کہ "بغیر حساب" معمول ہے "فامنن او امسک" کا یعنی یہ ہماری عطا ہے خواہ دو یا نہ دو۔ آپ سے اس کے حقوق کے متعلق کوئی سوال اور بازپرس نہ ہوگی، جس طرح چاہو تصرف کرو کلی اختیار ہے۔ دوسری تفسیر مجھے زیادہ پسند ہے اور واقعی علیہ السلام کے لئے اتنی بڑی سلطنت اور اس کا ساز و سامان خارجان ہوجاتا، اگر انکی تسلی اس طرح نہ کی جاتی۔ جب "بغیر حساب" فرماکر بار غم ہلکا کردیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بے فکری سے سلطنت کی۔ اس سے ظاہراً سامان کی کثرت کا موجب پریشانی ہونا ثابت ہوگیا تب ہی تو ان کا ازالہ کیا گیا۔ اسی واسطے جب حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ چاہے مَلِکْ ہونا اختیار کرلیں یا نبی ہونا اختیار کرلیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ سے نبی عبد ہونا اختیار کیا۔ اگر آپ بھی نبی مَلِکْ ہونا چاہتے ہیں تو آپ سے بھی یہی ارشاد ہوتا هٰذَا عَطَاؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ، اور اس سے آپ کی بھی تسلی کردی جاتی۔ مگر آپ نے سلطنت پر عبدیت کو ترجیح دی اور غنا ظاہری اختیار نہیں فرمایا دوسرے اگر غنائے ظاہری ہی مراد لی جائے۔ جیسا مفسرین میں یہی مشہور ہے تو گو آپکے پاس

مال جمع نہ رہتا تھا اور اسی سے شبہ عدم غنائے ظاہری کا ہو سکتا ہے مگر جو مقصود ہے، مقصود ظاہری سے کہ کوئی مصلحت اٹکی نہ رہے وہ مقصود اس طرح حاصل کہ وقتاً فوقتاً اس قدر مال آتا تھا کہ سلاطین و امراء کی طرح آپ خرچ فرماتے تھے جنمیں یہ بھی حکمت تھی کہ آپ مقتدا تھے اور مقتدا کے لئے وقعت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ عرفاً تمول سے ہوتی ہے بشرطیکہ تمول پر تحول بھی مسلط ہو (یعنی سخاوت بھی ہو کہ لوگوں کو دیتا دلاتا رہے جس سے مال چلتا پھرتا) چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری غنا کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ نے حج وداع میں سو اونٹ قربان کئے جس میں تریسٹھ اپنے دست مبارک سے نحر کئے جس کی تفصیل حدیث میں آتی ہے کلھن یزدلفن الیہ کہ اونٹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اپنی گردن بڑھاتا تھا گویا ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ پہلے مجھے ذبح کیجئے۔ سبحان اللہ کیا شانِ محبوبیت تھی ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف　　بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

یہ شعر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شان میں زیادہ چسپاں ہے۔ واقعی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے ہی تھے کہ جانور اپنی گردنیں خود آگے بڑھاتے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کاش پہلے میں آپ کے ہاتھ میں ذبح ہو جاؤں تو اتنے اونٹوں کا ذبح ہونا بدون ظاہری غنا کے کم ممکن ہے۔ اسی طرح آپ کی عطار اور سخاوت کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ آپ نے سو سو دو سو اونٹ ایک ایک شخص کو عطا فرمائے۔ ایک اعرابیوں کا بکریوں کا بھرا جنگل عنایت فرما دیا۔ بحرین سے جب مال آیا تو وہ اتنا تھا کہ مسجد میں سونے چاندی کا ڈھیر لگ گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کا سب ایک دم سے بانٹ دیا اور بعض صحابہ کو اتنا دیا جتنا وہ اٹھا سکتے تھے۔ ایسی نظریں تو سلاطین کے یہاں بھی نہیں سنی جاتیں۔ اور اس سے آپکا غنائے ظاہری بھی ظاہر ہے کیونکہ عطائے ظاہری کی حقیقت مال کا رکھنا نہیں ہے بلکہ مال کا خرچ کرنا ہے وہ بوجہ اکمل ثابت ہو گیا۔

(انوار الیتامیٰ ص۳۸)

۳۳- جنت میں شہدا کی ارواح کا سبز پرندوں میں ہونا۔

جنت میں وہ جسم طیر[1] شہداء کے لئے مرکب ہو گا۔ ان کا حقیقی جسم وہ نہ ہو گا بلکہ ان کے لئے جسم انسانی دوسرا ہو گا۔ پس ارواح شہداء کا جو اصل طیور خضر میں ہونا ایسا ہے جیسا کہ دنیا میں اہم بہل اور بگھی یا ڈولی اور پالکی میں سوار ہوتے ہیں۔ اگر اور بگھی بند ہو تو دیکھنے والے کو بھی معلوم ہو گا کہ پالکی اور بگھی آ رہی ہے ہمارا جسم ان کو نظر نہ آئے گا۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائیگا کہ بگھی اور پالکی ہمارا جسم ہے اور ہماری روح اس کے اندر جو آدمی بیٹھا ہے اس کا جسم بگھی اور پالکی کے جسم سے علیحدہ ہے اور یہ محض اس کی سواری ہے اسی طرح یہاں سمجھئے کہ جنت میں ارواح شہداء کے لئے سبز پرندوں کا جسم بمنزلہ پالکی کے ہو گا اور اس کے اندر روح انسانی اپنے جسم کے ساتھ سوار ہو گی پس اس سے انسان کا پرندہ بن جانا لازم نہیں آتا۔ یہ صورت جب لازم آتی کہ روح انسانی اپنے جسم سے علیحدہ ہو کر جسم طیر میں حلول کرتی۔ اور وہاں یہ بات نہ ہو گی کہ اب رہی یہ بات کہ وہ جسم انسانی کون سا ہے جس کے شہداء کی روحیں حلول کر کے جو اصل طیور خضر میں سوار ہونگی۔ آیا وہ یہی جسم عنصری ہے یا کوئی دوسرا جسم ہے اس کی تحقیق کے لئے کشف کی ضرورت ہے کیونکہ نص اس سے ساکت ہے اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ عالم برزخ میں انسان کو جسم مثالی عطا ہوتا ہے جو اسی جسم عنصری کے مشابہ ہے مگر اس سے زیادہ لطیف ہوتا ہے لیکن یہ جسم مثالی صرف برزخ ہی میں انسان کو عطا ہو گا۔ اور جنت و دوزخ میں یہی جسم عنصری پھر مل جائے گا گو برزخ میں جسد عنصری کا ہونا کچھ محال نہیں۔ مگر خلاف مشاہدہ ہے۔ اہل کشف کو معلوم ہوا ہے کہ برزخ میں عذاب و ثواب ارواح کو جسم مثالی کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔　(ترجیح الآخرۃ ص۳۲)

۳۴- اہل دنیا کے آخرت کا نفع دنیا کے نفع سے بڑھا ہوا ہے

اس کا جواب بھی سن لو "وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى" اس میں جواب ہے

[1] پرندہ۔

اس عذر کا جس سے اس کا غلط ہونا معلوم ہوگیا۔ حاصل جواب کا یہ ہے کہ کسی منفعت کا محض عاجل ہونا اسکی ترجیح کے لئے کافی نہیں بلکہ ترجیح کے اور اسباب بھی ہوتے ہیں۔ سو دنیا میں ہر چند یہ صفت ہے کہ وہ عاجل ہے مگر آخرت میں اس کے مقابل دو صفتیں ہیں۔ ایک خیریت، دوسرے بقاء یعنی دنیا سے آخرت عمدہ اور کثیر بھی ہے اور پائیدار رہنے والی بھی ہے، دنیا میں نہ وہ عمدگی اور زیادت ہے نہ پائیداری ہے اور ان دونوں میں سے ہر صفت ایسی ہے کہ اس کے مقابل وصف عاجل کو ہرگز کوئی ترجیح نہیں دنیا کیونکہ اگر عاجل ہونا ہمیشہ موجب ترجیح ہو تو پھر تجارت کبھی نہ ہو سکے کیونکہ اس سرمایہ عاجلہ کو اس وقت لگانا پڑتا ہے اور نفع زائد آجل ہے لیکن تمام عقلاء اس وجہ سے تجارت کو موقوف نہیں کرتے کہ اس کا نفع بعد میں حاصل ہوتا ہے اور سرمایہ اس وقت موجود ہے بلکہ سب لوگ خوشی کے ساتھ موجودہ سرمایہ کو تجارت میں لگا دیتے ہیں محض اس امید پر کہ آئندہ نفع زائد ملے گا۔

معلوم ہوا کہ زیادہ و کثرت کے مقابلے میں وصف عاجل نظر انداز کر دیا جاتا ہے پھر تم آخرت پر دنیا کو اس وجہ سے کیوں مقدم کرتے ہو کہ وہ عاجل ہے اور نفع آخرت آجل ہے۔ تم نے یہ بھی سوچا کہ آخرت دنیا سے کتنی زیادہ اور کتنی عمدہ ہے۔

اسی طرح زراعت بھی دنیا میں نہ ہو سکتی کیونکہ اس میں بھی موجودہ غلہ کو آئندہ کی امید پر مٹی میں ملا دیا جاتا ہے۔ اگر تم منفعت عاجلہ کے ایسے ہی عاشق ہو، پس زراعت کو بھی جواب دیدو، مگر تم ایسا نہیں کرتے بلکہ ہر سال زراعت کرتے ہو، کیونکہ اس میں زیادہ ملنے کی امید ہے۔ پھر آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے اس وصف کو کیوں دیکھتے ہو کہ وہ عاجل ہے (یعنی جلدی ملنے والی ہے) اور یہ آجل ہے (یعنی دیر سے ملنے والی ہے) اور وہ آجل ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیا کسی قابل بھی نہیں اور دوسری صفت آخرت میں یہ ہے کہ وہ "وابقیٰ" ہے بہت پائیدار ہے۔ اور پائیداری بھی خود ایسا وصف ہے کہ اس کے مقابلے میں وصف عجلت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ دنیا میں اسکی صدہا نظیریں ہیں۔ ایک شخص آپ کو مکان دینا چاہتا ہے مگر اس کے پاس دو مکان ہیں ایک تو کچا بنا ہوا ہے، اور چھوٹا بھی ہے اور دوسرا پختہ اور عالیشان ہے اور وسیع بھی ہے۔ وہ آپ سے کہتا ہے کہ اگر تم پختہ مکان لینا چاہتے ہو تو میں یہ بھی دے سکتا ہوں مگر چار سال کے بعد یہ واپس لے لیا جائے گا اور اگر کچا مکان لینا ہو تو وہ ہمیشہ کے لئے تمہاری ملک کر دوں گا۔ آپ بتلائیے کیا کہیں گے؟

یقیناً ہر عاقل یہی کہے گا کہ بھائی اس عالیشان محل سے جو عاریۃً ملتا ہے، وہ کچا مکان اچھا ہے جو دائماً ملک ہو۔

دنیا کی وجہ سے آخرت چھوڑنا

مگر افسوس تم دنیا و آخرت کے معاملہ میں اس فیصلہ کو نظر انداز کرتے ہو کہ آخرت کو جو دائمی ہے۔ دنیا کے لئے چھوڑتے ہو جو چند روزہ ہے۔ انسان کی حیات ہی کیا ہے۔ بعضے لوگ رات کو اچھے خاصے سوتے اور صبح کو مرے ہوئے پائے گئے۔ اس ناپائیدار مردار کے لئے تم اپنا اصلی وطن برباد کرتے ہو جو ہمیشہ کے لئے حق تعالیٰ تمہارے نام کرنا چاہتا ہے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ یہاں معاملہ برعکس ہے کہ دنیا ہے عاجل کوئی... عالی شان و خوب صورت بھی زیادہ نہیں ہے۔ آخرت اس سے کہیں اور کتنی ہی بڑی ہے اور نہایت خوب صورت و عالی شان ہے۔ تو یہاں تم ایک کچے اور ناپائیدار مکان کے لئے جو عاریۃً مل رہا ہے اور عاریت بھی سال دو سال کے لئے نہیں بلکہ ایک دو لمحہ کے لئے کیونکہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ شاید ہمیں نفس نفس بود ایسے عمدہ و عالیشان محل کو چھوڑتے ہو جو دواماً تمہاری ملک کیا جاتا ہے۔ اب بتلاؤ تمہارا وہ عذر کہاں گیا کہ صاحب دنیا تو ابھی مل رہی ہے اور آخرت کا معاملہ ادھار پر ہے صاحبو! دنیا تو ایک دو لمحے کے لئے مل رہی ہے جس میں کچھ راحت نہیں، کلفت ہی کلفت ہے اور آخرت ہمیشہ کو مل رہی ہے جہاں رنج و غم کا نام نہیں جس کو دیکھ کر بے ساختہ کہو گے۔ الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور ط الذی احلنا دار المقامۃ من فضلہ لا یمسنا فیہا نصب ولا یمسنا فیہا لغوب ط۔

آخرت کا نفع یقینی ہے

رہا یہ شبہ کہ آخرت کا ادھار ایسا ہے کہ نہ معلوم کب ملے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ تاخیر زائد کی وجہ سے عاجل کو ترجیح اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ موجل کے ملنے کا پورا یقین نہ ہو۔ اور اگر پورا یقین ہو کہ یہ موجل ضرور ملے گا تو وہاں تاخیر زائد کی بنا پر عاجل کو ترجیح نہیں ہو سکتی۔ اب یہ دیکھو کہ آخرت کا وقوع محتمل ہے یا یقینی، فرماتے ہیں، ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ ط صحف ابراھیم وموسیٰ یعنی آخرت کا آنا ایسا یقینی ہے کہ خبر متواتر سے ثابت ہے، ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے وقت سے اس کی خبر ہر زمانے میں دی جا رہی ہے۔ لہٰذا یہ عذر بھی باطل ہوا۔ اور ایک جواب میں پہلے دے چکا ہوں کہ آخرت کے آنے میں صرف تمہاری موت کی دیر ہے۔ مرنے کے بعد ہی سے تم کو آخرت

کی نعمتوں کا مشاہدہ ہوجائے گا۔ اور مرنے میں دیر ہی کیا ہے۔ زندگی کا دو منٹ بھی بھروسہ نہیں لہٰذا تاخیر زائد کہنا ہی غلط ہے۔

اور تیسرے جواب کی طرف اس آیت میں ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام کا نام ذکر کرکے اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اعمال آخرت کا ثمرہ سب ادھار ہی نہیں بلکہ حیات دنیا میں بھی اس کے ثمرات حاصل ہوتے ہیں چنانچہ حضرات ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے واقعات دنیا کو معلوم ہیں کہ انہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی کیسی کامیابی اور فلاح و عزت و راحت عطا فرمائی کہ ان کے دشمن مغلوب و مقہور ہوئے اور وہ غالب و قاہر ہوئے دشمنوں کے نام لینے والے بھی ناپید ہوگئے ہیں اور ان حضرات کے نام لینے والے اتباع و تعظیم کرنے والے ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں۔ تو خیریت و بقاء کا نمونہ دنیا میں اللہ کے بندوں کو عطا ہوتا ہے۔

(ترجیح الآخرت ص۴۴ تا ۴۷)

۴۳۔ حسن یوسف علیہ السلام و جمال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق۔

شاید کسی کو شبہ ہو کہ یوسف علیہ السلام کا حسن تو ایسا تھا کہ زنانِ مصر نے آپ کی صورت دیکھ کر بدحواسی میں ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات کہاں تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن کی انواع ہیں حسن کی ایک نوع یہ ہے کہ وہ دیکھنے والے کو دفعۃً متحیر کردے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی سہار ہوتی جائے۔ یوسف علیہ السلام کا حسن ایسا ہی تھا چنانچہ زلیخا کو آپ کے حسن کی سہار ہوگئی تھی۔ انہوں نے ایک دن بھی ہاتھ نہیں کاٹے۔ اور ایک نوع حسن کی یہ ہے کہ دفعۃً تو متحیر نہ کرے مگر جوں جوں اس کو دیکھا جائے تحمل سے باہر ہوتا جائے جس قدر غور کیا جائے اسی قدر دلیل میں گھستا جائے۔ اسی کو شاعر بیان کرتا ہے ؎

یزیدك وجهه حسنا اذا ما زدته نظرا!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن ایسا ہی تھا کہ اس میں دفعۃً متحیر کر دینے کی شان ظاہر نہ تھی۔ کیونکہ آپ میں خداداد عظمت و جلال کی ایک شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے پر سب سے پہلے اس کا اثر پڑتا تھا جس کی وجہ سے دیکھتے ہی نیا آدمی مرعوب ہوجاتا تھا۔ اس کو حسن صورت پر آنکھ بھر کر نگاہ ڈالنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ تاکہ تحیر کی نوبت آئے۔ کما فی حدیث من رواہ بداھتہ ھابہ۔ اخرجہ الترمذی فی الشمائل (جامع) اس پر منکشف ہوتا تھا۔ اور دن

بدن دل میں گھر کرتا چلا جاتا تھا (کما فی حدیث علی المذکور من خالطہ بشاشتہ احبہ) یوسف علیہ السلام کے حسن پر عورتوں کا عاشق ہوجانا منقول ہے مگر فی نفسہ یہ زیادہ بعید نہیں۔ بلکہ ایک فطری امر ہے جو عادت کے مطابق ہے گو کسی درجہ خاص میں خارق عادت بھی ہے۔ اور حضور پر نور پر مرد عاشق تھے جن میں بچے بھی تھے بوڑھے بھی تھے، مردوں کا عاشق ہونا اور وہ بھی بچوں اور بوڑھوں کا فی نفسہ بھی بہت عجیب ہے۔ ایک عاشق صحابی فرماتے ہیں۔ رأیتہ صلی اللہ علیہ وسلم لیلۃ فی حلۃ حمراء والقمر طالع، وکنت اری القمر مرۃ والی وجھہ صلی اللہ علیہ وسلم مرۃ فواللہ کان وجھہ احسن منہ۔ (او کما قال)۔ یعنی ایک رات میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سرخ (دھاریدار) جوڑے میں دیکھا۔ اس وقت چاند نکلا ہوا تھا تو میں کبھی آپ کے چہرہ پر نظر کرتا۔ کبھی چاند کو دیکھتا۔ بخدا آپ کا چہرۂ مبارک چاند سے زیادہ خوبصورت تھا۔ اسی کو کسی شاعر نے عجیب لطیف عنوان سے تعبیر کیا ہے ؎

گہے بسوئے تو گاہے بسوئے مہ می نگرم کند مقابلہ چوں کس کتاب را تنہا۔

یعنی کتاب کے مقابلے کے لئے تو دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے میں تنہا کیونکر مقابلہ کروں۔

ایکمرتبہ حضرت طلحہ صحابی رضؓ نے لڑائی میں اپنے ہاتھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سپر بنایا تھا۔ کفار کے جتنے تیر آتے تھے وہ سب کو اپنے ہاتھ پر روکتے تھے۔ تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی تیر نہ لگنے پائے۔ یہ عشق نہ تھا تو اور کیا تھا۔ اس کے علاوہ صحابہ کی محبت کے واقعات کتابوں میں بکثرت سے موجود ہیں۔ بہت سے صحابہ نے آپ کی محبت میں گھربار چھوڑا۔ بیوی بچے چھوڑے اپنے عزیزوں کو جب کہ وہ حضورؐ کے مخالف ہوئے بے دریغ قتل کیا، حتیٰ کہ خود اپنی جانیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نثار کردیں اور سر کٹوائے۔ اسی حسن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ؎

لواحی زلیخا لو رئین جبینہ لآثرن بالقطع القلوب علی الید

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن دل میں گھستا تھا اگر آپ کو زنان مصر دیکھ لیتی تو بجائے ہاتھ کے دلوں کو چیر پھاڑ دیتی۔

پس اجمالاً حضور کے حسن کے متعلق میں اپنی گفتگو پر کفایت کرتا ہوں اور حقیقت میں اتنا بھی میرے مذاق کے خلاف ہے۔ باقی اس بات میں تفصیلی گفتگو کرنا تو میرے مذاق کے

بالکل خلاف ہے ۔ کیونکہ اس میں ایہام تنقیص کا ہوجاتا ہے ۔ (الرفع والوضع ص۱۱)

۳۵ - علماء کرام میں غیر خدا سے طبعی خوف کی وجہ ۔

بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ علماء کو ایسا ہونا چاہیئے ۔ یخشونه ولا یخشون احداً الا الله کہ بس خدا ہی سے ڈریں اور کسی سے نہ ڈریں ، ان کے نزدیک علماء کو نہ شیر سے ڈرنا چاہیئے ۔ نہ سانپ بچھو سے نہ توپ سے نہ بندوق سے نہ حکام سے نہ ڈاکوؤں سے ۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوچکا ہے کہ موذی چیز سے انبیاء علیہم السلام کو بھی خوف طبعی ہوتا ہے ، اگر یہ خوف طبعی توکل کے خلاف ہے تو کیا معاذ اللہ انبیاء کو غیر متوکل کہو گے ؟ ہرگز نہیں ، کس کا منہ ہے جو اپنے کو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ متوکل بتائے ۔ مگر وہاں یہ حالت تھی کہ نبوت کے بعد ان کے دل میں فرعون سے بھی خوف تھا ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔ قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان یطغیٰ ۝ قال لا تخافا اننی معکما اسمع واریٰ ۝ موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو فرعون کی طرف سے یہ خوف ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے یا حد سے بڑھ جائے باوجودے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو صریح اور صاف حکم ہوچکا تھا اذھبا الیٰ فرعون انه طغیٰ ۝ فرعون کے پاس جاؤ کیونکہ وہ سرکشی پہ کمر باندھ رہا ہے مگر با ایں ہمہ موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام نے آجکل کے بہادروں کی طرح اپنی بہادری ظاہر نہیں کی کہ ہم کو نہ قتل کا خوف ہے نہ قید خانے کا اندیشہ ہے ہم بلا خوف و خطر اس خدمت کو انجام دیں گے بلکہ انہوں نے اپنے طبعی خوف کو حق تعالیٰ سے عرض کردیا کہ ہم کو اس کی زیادتی سے ڈر لگتا ہے ۔ اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم کو قتل نہ کردے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ طبعی خوف کا ہونا نبوت و ولایت کے بالکل منافی نہیں ۔ ورنہ حق تعالیٰ اس خوف پر انکار فرماتے مگر حق تعالیٰ نے اس پر ان کو ذرا ملامت نہیں کی بلکہ تسلی دے کر فرمایا لا تخافا اننی معکما ۝ تم ڈرو نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں اور دوسری جگہ ارشاد ہے نجعل لکما سلطانا فلا یصلون الیکما انتما ومن اتبعکما الغٰلبون ۝ ہم تم کو رعب عطا کرینگے جس کی وجہ سے وہ تم تک نہ پہونچ سکیں گے اور تم کو اور متبعین ہی کو غلبہ حاصل ہوگا ۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے طبعی خوف کے ازالے کا سامان کرلیا اس وقت فرعون کے پاس تشریف لے گئے اس سے معلوم ہوا کہ یخشونه ولا یخشون احداً الا الله میں خوف طبعی کی نفی نہیں ۔ بلکہ خوف عقلی

کی نفی ہے ۔

دوسرے یہ کہ یہ آیت تبلیغ احکام کے متعلق ہے ، اور مقصود یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام میں سوائے خدا کے کسی سے ایسا نہیں ڈرتے کہ وہ تبلیغ سے مانع ہوجاوے ۔ چنانچہ پوری آیت اس طرح سے الذین یبلغون رسالٰت الله ویخشونه ولا یخشون احداً الا الله وکفیٰ بالله حسیبا ۝ وہ انبیاء ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پہونچایا کرتے تھے اور اللہ ہی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے اور اللہ تعالیٰ حساب لینے کے لئے کافی ہے اس میں تبلیغ احکام کے وقت غیر اللہ کے خوف عقلی کی نفی کی گئی ہے ۔ رہا یہ ان کو کسی سے خوف طبعی بھی نہیں ہوتا یہ اس آیت کا مفہوم نہیں ۔ لوگ قرآن کو ادھورا پڑھتے ہیں اسلئے اشکال ہوتا ہے ۔ پورے مضمون پر نظر کرنے کے بعد کچھ اشکال نہیں رہتا غرض تبلیغ احکام کے وقت بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت خوف طبعی کسی درجہ کا لاحق نہیں ہوتا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کو فرعون سے طبعی خوف تھا اسی لئے انھوں نے حق تعالیٰ سے اپنا خوف ظاہر کرکے اس کا علاج چاہا بلکہ مطلب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام تبلیغ احکام ضرور کرتے ہیں اور تبلیغ کے متعلق خوف عقلی تو ان کو صرف خدا سے ہوتا ہے مخلوق کا خوف عقلی انھیں ذرا نہیں ہوتا جس کے اثر سے خوف طبعی مخلوق کا ان پر ایسا غالب نہیں ہوتا جو تبلیغ سے روک دے ۔ بلکہ اگر کسی وقت مخلوق سے ان کو خوف طبعی ہوتا بھی ہے تو وہ خشیت خداوندی سے مغلوب ہوجاتا ہے ۔

پس مخلوق کے خوف عقلی کی تو مطلقاً نفی ہے اور خوف طبعی کی مطلقاً نفی نہیں ۔ بلکہ اس کے غلبہ کی نفی ہے ۔ اب یہ مضمون انشاء اللہ کسی نص سے متعارض نہ ہوگا ۔ اب شاید کوئی یہ کہے کہ پھر علماء کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ مخلوق سے خوف ان کو ذرا نہ ہو اور خوف طبعی اگر ہو تو خوف خداوندی سے مغلوب ہو اس پر غالب نہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس جگہ علماء کے ذمے تبلیغ فرض ہوتی ہے وہاں بیشک ان پر خوف خداوندی ہی غالب ہوتا ہے ۔ مخلوق کا خوف طبعی غالب نہیں ہوتا مگر جہاں ان پر تبلیغ فرض ہی نہ ہو ۔ محض مستحب ہو ۔ وہاں اگر ان کو مخلوق سے خوف طبعی ہو تو اس میں کیا حرج ہے ۔ بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان پر تبلیغ ہر حالت میں فرض ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جن علماء کو تم خائف کہتے ہو وہ اس خوف کی وجہ سے کسی فرض و واجب کو ترک کردیتے ہیں یا مباح و مستحب کو ۔ اگر تم کو انصاف سے دلائل میں غور کرو گے تو تم کو معلوم ہوجائے گا کہ وہ مخلوق کے خوف سے کسی فرض و واجب کو ہرگز ترک نہیں کرتے ۔ بلکہ محض بعض مباحات ۔ یا بہت سے بعض مستحبات

کوترک کر رہے ہیں۔ سوایسی حالت میں وہ یخشونہ ولا یخشونہ احداً الا اللہ کے خلاف کیونکر ہو سکے۔ بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن مسائل کی تبلیغ آجکل کے بہادر لوگ کر رہے ہیں علماء بھی ان سب کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ صرف عنوان کا فرق ہے۔ بہادران قوم مقابلہ اور سب و شتم کے ساتھ تبلیغ کرتے اور جن کو تم خائف کہتے ہو وہ تہذیب اور نرمی کے ساتھ ان مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ اب صرف اس بات کا فیصلہ باقی رہا کہ مخالفین اسلام کے سامنے آیا ہم کو مقابلہ اور سب و شتم کے ساتھ احکام کو ظاہر کرنا چاہیئے یا نرمی اور تہذیب کے ساتھ سو اس کا فیصلہ خود قرآن نے کر دیا ہے۔

حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا فرما کر جب فرعون کے پاس تبلیغ احکام کے لئے جانیکا حکم فرمایا تو اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا دقولا لہ قولا لینا لعلہ یتذکر اویخشیٰ اور فرعون سے نرمی کے ساتھ بات چیت کرنا۔ شاید ان کو نصیحت ہو جائے یا خدا کا خوف اس کے دل میں آجاوے۔ دیکھ لیجئے، موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ کون متوکل ہوگا اور فرعون سے زیادہ ظالم و سرکش کون، مگر بایں ہمہ یہ حکم ہو رہا ہے کہ اس سے نرمی کے ساتھ گفتگو کیجئے گا۔

صاحبو! قاعدہ یہی ہے کہ جب کسی مخالف پر اپنا زور اور دباؤ نہ ہو وہاں مقابلہ اور سختی نافع نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر مضر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع میں اکثر نرمی ہی سے کچھ نفع ہوتا ہے (جامع)

(حرمات الحدود صفہ ۳۰)

۳۶۔ جنٹلمینوں کا انگریزی کو علم میں شمار کرنا غلطی ہے۔

جتنے فضائل احادیث میں علم کے لئے وارد ہیں۔ انگریزی تعلیم پر بھی ان کو جاری کرتے ہیں اور اس کے متعلق یہ حضرات ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں۔ اطلبوا العلم ولو بالصین ترجمہ: — علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں بھی ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چین سے طلب علم کی ترغیب دی ہے۔ حالانکہ اس وقت چین میں دین کا علم بالکل نہ تھا، بلکہ محض دنیادی علم تھا۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مطلق علم کی ترغیب دے رہے ہیں۔

خواہ دنیا کا علم ہو یا دین کا۔ پس انگریزی بھی علم ہے اور اس حدیث کے تحت میں داخل ہے۔ ان لوگوں کو اول تو اس حدیث کا ثبوت دینا چاہیئے۔ ان الفاظ سے یہ حدیث محدثین کے نزدیک ثابت ہی نہیں۔

(قلت ذکر لہ فی المقاصد طریقین وقال ہو ضعیف من الوجہین وقال ابن حبان انہ باطل لا اصل لہ واخرجہ ابن الجوزی فی الموضوعات فال واخرجہ البیہقی فی الشعب قلت قد التزم ان یخرج موضوعًا فالاشبہ الحکم علیہ بالضعیف والضعیف لا یحتج بہ فالاحکام جامع)

اور اگر ثابت بھی ہو تب بھی ان لوگوں کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا کیونکہ انہوں نے لفظ "ولو" پر نظر نہیں کی۔ یہ لفظ فرض کے لئے آتا ہے مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض چین میں بھی علم ہو تو وہاں سے بھی کوشش کر کے حاصل کرنا چاہیئے اور فرض اسی چیز کو کیا جاتا ہے جو معدوم و مستبعد ہو۔ موجود کو فرض نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد اس حدیث سے وہی ہے جو چین میں اس وقت موجود نہ تھا۔ اس لئے بطور فرض کے فرما رہے ہیں کہ اگر وہاں بھی ہو تو حاصل کرو اور علم دین ہی ہے ورنہ اگر علم کو ایسا عام کیا گیا کہ دنیوی علم بھی اس میں داخل ہو گیا تو ایک بھنگی اور چمار کو بھی عالم کہنا چاہیئے کیونکہ اس کو بھی دنیا کا ایک علم حاصل ہے جو کام وہ کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے اور اگر آپ ان کاموں کو بھی علم میں داخل کریں گے تو پھر آپ کی خاطر سے ہم انگریزی کو بھی اس میں داخل کر لیں گے اور خیر جانے دیجئے۔ ہم لفظ ولو سے بھی استدلال نہیں کرتے مگر ہم کہتے ہیں "اطلبوا العلم ولو بالصین" میں تو تصریح نہیں کہ اس سے کون سا علم مراد ہے۔ اب شریعت کی دوسری نصوص سے اس کو دریافت کیا جائے۔ بس علم وہ جس کو شریعت علم کہتی ہے۔ جس کے جاننے والوں میں ایک شیخ سعدی بھی ہیں۔ ع۔

"علمے کہ رہ بحق ننماید جہالت است"

اور حدیث میں ہے الدنیا ملعونۃ وما فیہا ملعون الا ذکر اللہ وما والاہ الحدیث، معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی طرف قریب نہ کرے وہ دنیا ہے ملعونہ ہے۔ اس میں ایسے علوم بھی داخل ہیں اب میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا سائنس اور جغرافیہ اور انگریزی زبان سے خدا کی طرف قرب ہوتا ہے۔ وصل ہوتا ہے یا فصل؟ قرب ہوتا ہے یا بعد؟ مشاہدہ ہے کہ ان سے بعد ہی بڑھتا ہے۔ گو چاہیئے تو یہ تھا کہ سائنس سے اور خدا کی طرف قرب بڑھتا کیونکہ

اس سے قدرت صانع کا انکشاف زیادہ ہوتا ہے اور اپنا عجز زیادہ مشاہد ہوتا ہے کیونکہ اہل سائنس رات دن ترقی کی فکر میں رہتے ہیں اسلئے ان کے مقاصد بہت وسیع ہیں جن میں کثرت سے ایسے مقاصد بھی ہیں جو عرصہ تک پورے نہیں ہوتے۔ زمانۂ دراز تک ان میں ناکامی رہتی ہے بخلاف ہمارے مقاصد کے کہ وہ معدودے چند ہیں۔ جو اکثر پورے ہو جاتے ہیں مگر ہم پھر بھی اپنے عجز کے معترف ہیں اور ان لوگوں کے زیادہ مقاصد ناکام رہتے ہیں جو کھلی دلیل ہے عجز کی۔ مگر یہ لوگ باوجود مشاہدہ عجز زائد کے پھر بھی اپنے کو قادر سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے عجز پر نظر نہیں کرتے۔ بس عرصہ کے بعد جو کسی مقصود میں کامیابی ہو گئی۔ اس پر نازاں ہوتے ہیں کہ ہم نے یہ ایجاد کر لی۔ ڈلے پھر ایجاد کر لی۔ اگر ایجاد تمہارے ہاتھ میں تھی تو پہلے ہی دن کیوں نہ ایجاد کر لی تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ سوچو اور غور کرو۔ باقی ذہن میں ایجاد کا صحیح طریقہ آجانا یہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہے۔ یہ محض حق تعالیٰ کے قبضے میں ہے۔ مگر عادت الٰہیہ ہے کہ جب کسی بات کے لئے انسان غور و فکر کرتا ہے تو وہ اکثر راستے کھول دیتے ہیں۔ اور بعض دفعہ اپنی قدرت ظاہر کرنے کے لئے ہزاروں غور و فکر کے بعد بھی حقیقت ظاہر نہیں کرتے۔ چنانچہ اب تک کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی کہ مقناطیس لوہے کو کیوں جذب کرتا ہے اور ایسی نظائر بکثرت موجود ہیں اگر غور و فکر کے بعد حقیقت تک پہونچ جانا تمہارے اختیار میں ہے تو ان چیزوں کی حقیقت کا انکشاف کیوں نہ کر لیا۔ غرض تجربے سے یہ بات مشاہد ہے کہ کچھ عوارض کہ بمنزلہ لوازم کے ہیں۔ آپ سے جمع ہو رہے ہیں چونکہ سائنس اور جغرافیہ سے قرب خداوندی نہیں بڑھتا۔ بلکہ بُعد ہی ہوتا ہے تو یہ علم شرعی میں داخل نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے جاننے سے دین کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ ہاں ایسے لوگوں کو ایسا علم دین البتہ حاصل ہو جاتا ہے۔

جیسے ایک لیڈر کا قصہ ہے جو آج کل مسلمانوں کے مقتدا بنے ہوتے ہیں کہ کسی جگہ نماز کا وقت آگیا اور پانی نہ تھا۔ تیمم کی ضرورت ہوئی تو لیڈر صاحب نے اس طرح تیمم کیا کہ اول تو مٹی کو ہاتھوں پر بہایا۔ جیسا پانی کو بہایا کرتے ہیں۔ پھر کلی کرنے کیواسطے منہ میں ڈالتے اور مسح کے لئے سر پر بھی ڈالتے اور پیروں پر بھی مٹی بہاتے۔ مگر منہ میں دیتے ہوتے بعض لوگ ہنس پڑے اس لئے وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ بس انگریزی پڑھ کر ایسا علم ہوتا ہے کہ عقل خاک میں مل جاتی ہے بھلا اگر وہ کسی سے پوچھ ہی لیتے کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے تو اس میں کچھ حرج تھا؟ مگر پوچھتے کس طرح؟ لیڈر ہو کر اپنے جہل کو کیوں ظاہر کریں۔ گو مٹی سے کلی کر کے اس سے زیادہ جہل ظاہر کر دیا۔ اور

مزہ یہ کہ ظہور جہل کے بعد بھی وہ قوم کے لیڈر رہی رہے۔ یہ حالت قوم کی ہے کہ اس جہل پر بھی ان کو مقتدا ہی بنائے رکھا انھیں حضرت کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ موٹر میں سوار تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ موٹر ٹھہرایا گیا اور اسی میں بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لی۔ حالانکہ سامنے سڑک پر ایک طرف کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتے تھے۔ مگر انہوں نے موٹر کے اندر بیٹھ کر ہی پڑھی۔ بھلا موٹر میں ترک قیام کس طرح جائز ہو گیا جبکہ موٹر کھڑا ہوا تھا چلتی ریل میں تو اگر گرنے کا اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز کی گنجائش بھی ہے۔ مگر موٹر میں چلتے ہوئے بھی ترک قیام کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کا ٹھہرا لینا ہر وقت ہمارے اختیار میں ہے اور ریل گاڑی کا ٹھہرانا ہمارے اختیار میں نہیں۔ اور اگر موٹر ٹھہرا ہوا ہو تب تو کسی طرح ترک قیام کی گنجائش نہیں۔ مگر ان لوگوں نے تو محض لیڈر بننے کے لئے نماز شروع کی ہے اس لئے نماز بھی لیڈری میں ہوتی ہے۔ شرعی نماز کی ان کو کیا ضرورت ہے گو ایسی غلطیاں دیہاتیوں سے بھی ہوتی ہیں اور ان کو مسائل کا علم نہیں۔ مگر وہ اپنے کو تعلیم یافتہ تو نہیں کہتے نہ علم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ بلکہ بیچارے اپنے جہل کا اقرار کرتے ہیں تو گو ان سے بھی علم دین سے غفلت کرنے پر کچھ مواخذہ ہو۔ مگر شاید ان کے عجز و نیاز کی وجہ سے ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ ہو جائے چاہے تھوڑی سی سزا کے بعد ہی سہی، حق تعالیٰ کو عاجز پر رحم آتا ہے۔ اس لئے بعض دفعہ گنہگاروں کو انکی عاجزی پر بخش دیا جاتا ہے۔ اور دعوے کے ساتھ سارا علم اور تصوف اور تقویٰ دھرا رہ جاتا ہے۔

(الہدیٰ والمغفرۃ ص[۱۳])

۳۷۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خدا سے طلب کرنا محبت الٰہی کا نتیجہ ہے

اللّٰھم انی اسئلك الجنۃ وما قرب الیھا من قول او عمل۔

ترجمہ:۔ اے اللہ میں آپ سے جنت مانگتا ہوں اور پھر وہ چیز مانگتا ہوں جو جنت سے نزدیک کرنے والی ہو، قول ہو یا عمل، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کی رغبت سے عمل کرنا سب سے ارفع حالت ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی۔ تو سمجھ لیجئے کہ ارفع تو وہی حالت ہے کہ محض رضائے محبوب کے لئے عمل کیا جائے۔ رہا حضورؐ کا جنت مانگنا، سو اس کے متعلق وہ بات یاد کر لیجئے جو میں نے پہلے بیان کی ہے کہ عاشق کو محبوب کی چیزوں سے

بھی محبت ہوا کرتی ہے۔ پس آپ کا جنت مانگنا ویسا نہیں ہے جیسا ہمارا مانگنا ہے۔ ہم تو جنت اس لئے مانگتے ہیں کہ وہاں ہم کو آرام ملے گا حوریں ملیں گی۔ خوب مزے اڑائیں گے۔ غرض ہم کو حظ نفس مطلوب ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اس بنا پر تھا کہ وہ خدا کی چیز ہے، اور خدا تعالیٰ آپ کو مانگنے کا امر فرمایا ہے جب محبوب خود چاہے کہ مجھ سے میری چیزیں بھی مانگو تو اس وقت مانگنا ہی موجب رضا ہے۔ اس وقت استغنار مناسب نہیں ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں　　　خاک برفرق قناعت بعد ازیں۔

اسلئے آپ نے جنت مانگی۔ اور اس سے استغنا نہیں برتا، عارف کامل خدا کی ادنیٰ نعمت سے بھی استغنا ظاہر نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ جنت سے جو کہ اصل النعم ہے وہاں کوئی ابن الفارض جیسا صاحب حال ہو تو وہ بلا سے استغنا ظاہر کر دے۔ اور ایسے لوگ غلبۂ حال سے معذور ہوں گے۔ ورنہ معرفت کا مقتضا یہی ہے کہ جیسے محبوب سے رضائے محبوب طلب کی جاتی ہے اسی طرح جس چیز کا اسے مانگنا پسند ہو، وہ بھی مانگے اور یہ بھی درحقیقت طلب رضا ہی ہے۔ کسی دوسری چیز کی طلب نہیں۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کا سوال اس بنا پر بھی کرتے تھے کہ وہ محل دیدار ہے۔ تو درحقیقت یہ جنت کا سوال نہ تھا بلکہ دیدار محبوب کا سوال تھا۔ اسی کو کہتے ہیں ع۔

"عاشقان جنت برائے دوست می دارند دوست"

اور ایک بات اس سے بھی باریک ہے وہ یہ کہ بعض دفعہ جنت کی طلب اس نیت سے بھی نہیں ہوتی کہ وہاں محبوب کا دیدار ہوگا۔ بلکہ محض اس خیال سے تمنا کی جاتی ہے کہ ہماری شان تو کہاں جو دیدار کی تمنا کریں ہم تو اگر جائے دیدار ہی کو دیکھ لیں تو بڑی قسمت ہے۔

ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ بڑے حوصلے کے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے کو اس قابل بھی نہیں سمجھتے کہ قبہ خضرا ہی نظر آئے ؎

مرا ز زلف تو موئے پسند است　　　ہوس را رہ مدہ بوئے بس است

تو بعض دفعہ غلبۂ تواضع طلب جنت کا منشا ہوتا ہے کہ عاشق اپنے کو وصال محبوب کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس لئے تمنا کرتا ہے کہ میں اس کو دیکھنے کے تو لائق نہیں۔ کاش اس کے شہر ہی میں جا رہا ہوں۔ اور کبھی اپنی احتیاج و افتقار ظاہر کرنے کے لئے جنت کی طلب

کی جاتی ہے کہ اے اللہ میں آپ کی رضا کا محتاج کیوں نہ ہوگا میں تو جنت تک کا بھی محتاج ہوں۔ اس لئے بطور اظہار احتیاج کے دعا کی جاتی ہے کہ اے اللہ جنت دیدے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حال پیش نظر ہوتا تو آپ کھانا کھا کر فرمایا کرتے تھے۔ الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین غیر مودع ولا مکفور ولا مستغنیً عنہ ربنا۔ یعنی اے اللہ اس وقت پیٹ بھر گیا ہے۔ اسلئے کھانے کو اٹھا دیا ہے ہم اس کو ہمیشہ کے لئے وداع نہیں کرتے نہ اس کی ناقدری کرتے ہیں۔ اور نہ اے اللہ ہمیں اس سے استغنا ہے حقیقت میں آپ کی اداؤں کی یہ حالت ہے کہ ؎

؎ ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

آپ کی جس ادا کو دیکھو اس میں غضب کی دلربائی ہے پھر کمال یہ ہے کہ اس میں نہ تصنع نہ تکلف، بلکہ ایک بیساختہ حال ہے ؎

؎ دل فریبان نباتی ہمہ زیور بستند۔
دلبر ماست کہ باحسن خدا داد آمد۔

مخالفین نے بھی ان باتوں کو دیکھ کر آپ کی سچائی کی شہادت دی اور ان کو ماننا پڑا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جس قدر کمالات تھے وہ اصلی تھے تصنع اور بناوٹ کا وہاں نام نہ تھا۔ غرض ایک مبنیٰ طلب جنت کا یہ بھی ہوتا ہے یعنی اظہار احتیاج۔ بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنا اور ہمارا مانگنا برابر نہیں اور آپ کے سوال کا یہ مطلب نہیں کہ عمل جنت کے واسطے کرنا چاہیئے بلکہ اس کا منشا آپ کی شان کے مناسب تھا وہ اپنے علم کے موافق عرض کر دیا۔ لیکن اگر کوئی شخص جنت ملنے ہی کی نیت سے عمل کرے تو وہ بھی راہ صواب پر ہے غلط راہ پر نہیں، خدا تعالیٰ سے محبت ہونی چاہیئے خواہ بلا واسطہ براہ راست ہو یا جنت کے واسطے سے ہو سب ٹھیک ہے ؎

؎ بخت اگر مدد کند دامنش آرم بکف
گر بکشد زہے شرف ور بکشم زہے طرب

یعنی مقصود قرب ہے بس قرب ہونا چاہیئے خواہ میں انہیں کھینچ لوں یا وہ مجھے کھینچ لیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ مقصود تو کام چلنا ہے کہ بندے کو خدا کی اطاعت و ذکر کی

توفیق ہو جاوے۔ اب وہ خدا کی براہ راست محبت سے ہوا تو کیا، اور جنت کی رغبت سے ہوا تو کیا دونوں راستے ٹھیک ہیں (اور دونوں بڑھیاں ہیں۔ گو ایک رفیع ہے اور ایک ارفع۔

(رذم البیان ص۴۸)

۳۸- انبیاء علیہم السلام پر نزع کی کیفیت کیوں ہوتی ہے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نزع میں بہت شدت ہوئی حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت نزع دیکھ کر میں کسی کی سہولت نزع دیکھ کر اس کی ..... تمنا نہیں کرتی اسی طرح بعض اولیاء کو بھی نزع شدید ہوتا ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ تو بات یہ ہے کہ شدت نزع کا سبب تو تعلقات ہی ہیں۔ جس قدر روح کو ناسوت سے تعلق ہوگا اسی قدر نزع میں شدت ہوگی۔ مگر تعلقات دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو مانع عن الآخرت ہیں۔ جیسے جائداد اور مال وغیرہ کی محبت۔ ان سے جو نزع میں شدت ہوتی ہے اس سے تکلیف سخت ہوتی ہے دوسرے وہ تعلقات ہیں جو آخرت سے مانع نہیں ہیں بلکہ معین آخرت ہیں، اور یہ وہی تعلقات ہیں جو اسکے مصداق داخل ہیں ؎

"اسیرش نخواہد خلاصی زبند"

اس کی تعیین عنقریب آتی ہے۔ اس سے بھی نزع میں شدت ہوتی ہے مگر اس سے روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ وہ شدت لذیذ ہوتی ہے کیونکہ اس کا منشاء قید لذیذ ہے۔ تفصیل اسکی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حقیقی تعلق تو بجز ذات حق کے کسی سے نہیں ہوتا اور اس کا مقتضا سہولت نزع ہے مگر بعض حضرات کو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد خلق و تربیت طالبین کی خدمت سپرد ہوتی ہے اور یہ بدونِ الی الخلق کے نہیں ہو سکتی اس لئے ان کو امر حق سے مخلوق کی طرف توجہ کرنا پڑتی ہے اور اصلاح و ارشاد کے لئے ان سے ایک گونہ تعلق ہو جاتا ہے اور یہ تعلق چونکہ بامر حق ہے اس لئے آخرت سے مانع نہیں ہوتا۔ بلکہ موجب امداد و سبب ترقی ہے جس سے جس قدر اصلاح و ارشاد کا فیض ہوگا اسی قدر اس کے درجات میں اضافہ ہوگا۔ چونکہ یہ خدمت سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کے سپرد کی گئی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو مخلوق کیساتھ یہ تعلق زیادہ ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام میں بھی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد

سب سے زیادہ یہ خدمت تھی، کیونکہ قیامت تک آنے والی مخلوق کے لئے آپ ہی رسول ہیں آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول آنے والا نہیں۔ تو آپ کو سب سے زیادہ ارشاد و اصلاح کا فکر و اہتمام تھا۔ اس لئے آپ کو نزع میں شدت زیادہ ہو گئی کیونکہ روح کو امت کے ساتھ تعلق تھا اور وصال کے وقت بھی آپ کو ان کا اہتمام تھا، مگر یہ تعلق لذیذ اور یہ فکر خوشگوار تھا آپ کے لئے اس میں اجر اور ترقی درجات تھی اس لئے شدت نزع سے جسم کو تو تکلیف ہوئی مگر روح کو کچھ تکلیف نہیں ہوئی انبیاء کے بعد بعض اولیا ایسے ہوتے ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد و تبلیغ ہوتی ہے ان کو بھی نزع میں بوجہ طالبین کی فکر کے شدت ہوتی ہے مگر ان کو انبیاء کے برابر شدت نہیں ہوتی کیونکہ ان کی ذمہ داری انبیاء کے برابر نہیں ہے اس لئے ان کو مخلوق کے ساتھ اصلاح و ارشاد کا تعلق بھی ان سے کم ہوتا ہے۔ اور جن بعض اولیاء کے سپرد یہ خدمت نہیں ہوتی وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں ان کو نہ کسی کا فکر ہے نہ کسی سے تعلق ہے ان کا نزع بہت سہل ہوتا ہے۔ ایسے لوگ مرتے ہوئے بڑے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں۔ بعضے غزل پڑھتے ہوئے جاتے ہیں۔ بعضے ہنستے ہوئے جاتے ہیں۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم
راحت جاں طلبم وزپے جاناں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

ایک بزرگ مرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم ۔۔۔ جسم بگذارم سراسر جاں شوم۔

ان کی یہ حالت دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان اولیاء سے افضل ہیں جن کے سپرد خدمت ارشاد ہے۔ کیونکہ وہ موت کے وقت ان کے برابر بے فکر نہیں ہوتے ان کو اپنی ذمہ داری کی بھی فکر ہوتی ہے اپنے متعلقین کا بھی خیال ہوتا ہے اسی وجہ سے ان کے نزع میں شدت بھی واقع ہوتی ہے مگر یہ اعتقاد افضلیت صحیح نہیں بلکہ اکثر وہی اولیاء افضل ہوتے ہیں جو صاحب ارشاد ہیں کیونکہ ان کی حالت انبیاء علیہم السلام کے مشابہ ہیں اور جو جتنا انبیاء کے مشابہ ہوگا وہ دوسروں سے افضل ہوگا۔ لیکن تم کو اس تجویز کا حق نہیں ہے کہ اپنے صاحب ارشاد ہونے کی تمنا کرو۔ بس بادشاہ کو اختیار ہے کہ

تمہارا امتحان لیکر جو عہدہ جس کو چاہے دے ۔ (العبرۃ بذبح البقرۃ صلا)

۳۹ ۔ تفاضل تفصیلی بین الانبیاء ممنوع ہے ۔

آجکل ایک سیرت[عہ] نبویہ شائع ہوئی ہے جس کو تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت مقبولیت حاصل ہے لوگ شوق سے اس کو خریدتے ہیں، کیونکہ کاغذ چکنا اور لکھائی عمدہ ہے ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن ایسا ہی ہوگا ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کسی نبی کی سیرت ہے ۔ کیونکہ کمالات نبوت سے اس میں بحث ہی نہیں ۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی مدبر بادشاہ کی سوانح عمری ہے ۔ زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر سے انتظام کا ہی پہلو دکھلایا گیا ہے اور اگر کسی جگہ اتفاق سے آپ کے کمالات نبوت کا ذکر بھی ہے ۔ تو غضب یہ کیا ہے کہ دوسرے انبیاء میں نقص نکالا گیا ہے ۔ چنانچہ شروع ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات کے جامع تھے ۔ اور دیگر انبیاء علیہم السلام تمام کمالات کے جامع نہ تھے ۔ کسی میں کوئی صفت تھی کوئی نہ تھی ۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بابت دعوی کیا ہے کہ وہ رحم خالی تھے ۔ اور دلیل میں یہ واقعہ پیش کیا ہے ۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۔ اے رب اب زمین پر کسی بسنے والے کو نہ چھوڑیئے سب کو تباہ کر دیجئے (جامع) یہ کتنی بڑی گستاخی ہے کہ نبی کو رحم سے خالی کہا جائے (انا للہ وانا الیہ راجعون) رہی دلیل تو اس کا جواب خود نص میں موجود ہے ۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بد دعا کی وجہ نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو سمجھایا غور کیجئے کہ سمجھانے کی بھی کوئی حد ہے ۔ اتنی مدت تک ان اذیتوں پر صبر کرنا تھوڑی بات ہے ذرا کوئی کر کے تو دکھلائے ۔ نو سو برس تو کیا نو ہی برس میں حقیقت معلوم ہو جائے گی ۔ تو نوح علیہ السلام کا یہ تھوڑا رحم ہے کہ اتنی مدت تک قوم کی بدحالی اور ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے اور بد دعا نہ فرمائی اس مدت کے بعد اگر وہ از خود بھی بد دعا فرماتے تو اس کو بے رحمی نہیں کہہ سکتے تھے ۔ چہ جائیکہ انہوں نے خود بد دعا نہیں فرمائی ۔ بلکہ جب ان کو وحی سے معلوم ہو گیا کہ اب ان میں کوئی ایمان نہ لائے گا اور ان کی تقدیر میں کفر ہی پر خاتمہ لکھا ہے ۔ اس وقت بد دعا فرمائی ۔ بتلائیے جب ایک قوم کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے

عہ یہ سیرت مولوی شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی کے نام سے تصنیف کی ہے ۱۲ ۔

تو اس وقت ان کا باقی رہنا بہتر ہے یا ہلاک ہو جانا ؟ ظاہر ہے کہ ایسی قوم کی بقا میں کچھ فائدہ نہیں بلکہ اندیشہ فساد ہے کہ یہ دوسروں کو بھی غارت کریں گے ۔ اس وقت ان پر بد دعا کرنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کے حق میں رحم ہے چنانچہ نوح علیہ السلام نے اپنی بد دعا میں اس بات کو ظاہر فرما دیا ۔ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ خداوندا اگر آپ ان کو زندہ چھوڑ دیں تو یہ آپ کے دوسرے بندوں کو بھی گمراہ کر دیں گے اور کافر و فاجر کے سوا کسی کو بھی نہ جنیں گے ۔ اور یہ بات نوح علیہ السلام نے اپنے قیاس سے نہیں فرمائی ، بلکہ وحی سے ان کو معلوم ہو چکا تھا کہ اب ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی بھی ایماندار نہ ہوگا واوحی الی نوح انہ لن یومن من قومك الا من قد امن فلا تبتئس بما کانوا یفعلون تو بتلائیے اس حالت میں اگر نوح علیہ السلام ان کے لئے نہ فرماتے تو اس کا انجام کیا ہوتا ۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تمام دنیا کافروں سے بھری ہوئی تھی ۔ مسلمان بہت ہی معدودے چند تھے ۔ اور کفار کے متعلق معلوم ہو چکا تھا کہ یہ نہ خود ایمان لائیں گے نہ ان کی اولاد میں کوئی مومن ہوگا اور مسلمانوں کی اولاد کے متعلق یہ یقین نہ تھا کہ یہ سب ایمان دار ہی ہوں گے بلکہ ان میں ایماندار اور کافر دونوں قسم کے لوگ ہونے والے تھے بلکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی غلبہ کفار ہی کو ہونیوالا تھا ۔ اب اگر اس زمانہ کے کافر غرق نہ کیے جاتے اور ان کی اولاد بھی اس وقت موجود ہوتی ۔ تو مسلمان کو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا (احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جتنے لوگ موجود ہیں وہ نوح علیہ السلام کے صرف تین بیٹوں کی اولاد ہیں ۔ جب تین آدمیوں کی اولاد میں کفار کا اس قدر غلبہ ہے جو مشاہدہ میں آ رہا ہے تو دنیا بھر کے آدمیوں کی اولاد میں کفار کا کیا کچھ غلبہ نہ ہوتا ۔ سب کافر ہی ہوتے ۔ اس مقدمہ کے ملانے کے بعد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نوح علیہ السلام نے مسلمانوں کے حال پر بہت ہی رحم فرمایا جو اپنے زمانہ کے کافروں پر بد دعا کی ۔ ورنہ آج کفار کا وہ غلبہ ہوتا کہ مسلمانوں کو حقیقت نظر آجاتی اور ان کا جینا محال ہو جاتا غرض اس سیرت کے مصنف نے صرف ایک پہلو کو دیکھا کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے واسطے ایسی سخت بد دعا کی جو بے رحمی معلوم ہوتی ہے مگر اس نے دوسرے پہلو کو نہ دیکھا کہ ان کی یہ بد دعا مسلمانوں کے حق میں خود جن میں یہ مصنف بھی داخل ہے ۔ سراسر رحم تھی ورنہ میاں کو آج دنیا میں رہنا اور کفار سے جان بچانا دو بھر ہو جاتا ۔

حضرت عیسی علیہ السلام پر اعتراض :۔ یہ اعتراض تو نوح علیہ السلام پر تھا

اس کے بعد لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست کا مادہ نہ تھا۔ نہ معلوم اس کے پاس کونسی وحی آگئی تھی۔ یا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چہرہ دیکھ کر قیافہ سے پہچان لیا تھا کہ ان میں یہ مادہ ہے اور وہ مادہ نہیں۔ کچھ نہیں اس اعتراض کا منشاء صرف یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اس سے ان حضرت نے یہ استنباط کرلیا کہ ان میں یہ مادہ ہی نہ تھا۔ حالانکہ عدم ظہور شئی ظہور عدم کو مستلزم نہیں بھلا اگر کسی شخص کو زندگی بھر روپیہ تقسیم کرنیکا موقع نہ ملے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں سخاوت کا مادہ نہیں ذرا اس کے ہاتھ میں روپیہ دیکر دیکھو اگر پھر بھی وہ سخاوت نہ کرے اس وقت تم کو اس بات کا حق ہے ورنہ دعویٰ بلا دلیل ہے

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اگر سلطنت کا موقع ہی نہ ملا تو اس سے ان کا تمدن و سیاست سے خالی ہونا کیسے لازم آگیا اور تم نے کیونکر سمجھ لیا کہ ان میں انتظامی قابلیت نہیں تھی یہ بات جب چل سکتی ہے کہ ان کو سلطنت کا موقع ملتا اور پھر انتظام نہ کرسکتے۔ پس اس شخص کا اعتراض تو لغو ہوگیا اب میں ثابت کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تمدن و سیاست اور انتظامی قابلیت بدرجہ کمال موجود ہے گو اس جوہر سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا اور اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کیف انتم اذا نزل فیکم عیسی بن مریم عدلا لامقسطاً (اوکما قال) تمہارا کیا حال ہوگا اس وقت جبکہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام تمہارے اندر (آسمان سے) نازل ہوکر آدینگے عادل منصف ہوکر حکومت کریں گے تو حضور نے اس وقت سے مسرت فرمائی جبکہ عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں میں حکومت کریں گے اور آپ ان کے متعلق عدل و اقساط کی خبر دے رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ عدل و انصاف بدون قابلیت انتظام کے نہیں ہوسکتا۔ عدل وہی کرسکتا ہے جس میں سیاست کا مادہ بدرجۂ کمال موجود ہو، نیز احادیث میں بھی یہی مذکور ہے کہ اس وقت بہت امن و امان اور خیر و برکت ہوگی جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نہایت عمدگی اور خوبی کے ساتھ سلطنت کا انتظام کریں گے اگر ان میں فی نفسہٖ یہ مادہ موجود نہیں تو اسوقت کیونکر سلطنت کا انتظام کرلیں گے پس معلوم ہوا کہ اس شخص نے نوح علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جامعیت پر جو اعتراض کیا ہے وہ نہایت لغو ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ثابت کرنیکا یہ کونسا طریقہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائیوں میں نقص نکالا جائے۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یاد رکھو! انبیاء علیہم السلام کامل ہیں۔ ان میں ناقص کوئی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکمل ہیں۔ تفاضل

بین الانبیاء سے اسی واسطے منع کیا گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بھائیوں کی تنقیص گوارا نہیں۔

الغرض انبیاء علیہم السلام کے مذاق باہم مختلف ہیں مگر کامل سب ہیں، اور ہر ایک کا مذاق خدا تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۲۴)

۴۰۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال بیان کرنے میں اعتدال

سرسید نے غضب کیا ہے کہ عرب کی مذمت لکھتے ہوئے آپ کہتے ہیں کہ اس قوم میں کینہ بہت ہے حتیٰ کہ وہاں کے جانوروں میں بھی اس صفت کا غلبہ ہے۔ چنانچہ شتر کا کینہ مشہور ہے مولوی محمد علی صاحب نے سرسید کے تفسیر کے رد میں ایک کتاب "البرھان" بہت ہی عمدہ لکھی ہے بڑی قابلیت سے جواب دیا ہے۔ انہوں نے اعتراض کا بھی بڑا عمدہ جواب دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ! اول تو جانوروں کے اخلاق سے انسانوں کے اخلاق پر استدلال کرنا عجیب طریقہ استدلال ہے۔ پھر ہم سید صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شتر کینہ جو مشہور ہے یہ عرب کا محاورہ ہے یا فارس کا۔ ظاہر ہے کہ یہ عرب کا محاورہ نہیں فارس کا ہے تو اس سے بہت سے بہت یہ لازم آیا کہ فارس کے اونٹوں میں کینہ ہوتا ہوگا۔ عرب کے اونٹوں میں اس صفت کا ہونا کیسے لازم آیا۔ اور اگر مان لیا جاوے کہ عرب کے اونٹوں میں بھی یہ صفت ہے تو آپ نے اس کے ایک عیب کو تو دیکھ لیا۔ اس کی دوسری خوبیوں کو بھی تو بیان کیا ہوتا۔ ع

"عیب آں جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو"

اونٹ میں اگر ایک عیب کینہ کا ہے تو ہزار باتیں مدح کی ہیں۔ اس میں تحمل و جفاکشی بہت ہے۔ قناعت کا مادہ بہت ہے۔ عرب کے اونٹ مطیع و منقاد بہت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے خود دیکھا ہے کہ جہاں کسی نے اونٹ پر سوار ہونے کے لئے اس کی گردن کو جھکایا وہ فوراً زمین پر رکھ دیتا ہے پھر سوار کے پاؤں رکھنے کے بعد آہستہ آہستہ اس طرح اٹھاتا ہے کہ سوار نہایت سہولت سے پشت تک پہونچ جاتا ہے۔ لوگ کثرت سے اس طرح چڑھتے اترتے ہیں، اونٹ کی لمبی گردن سیڑھی کا کام دیتی ہے تو اگر اس کے ایک عیب سے عرب کے ایک عیب پر استدلال کیا گیا ہے تو اس کی خوبیوں سے تو اس کی ان خوبیوں سے بھی تو اہل عرب

کی خوبیوں پر استدلال کیا ہوتا۔

عربی گھوڑے

پھر عرب میں جہاں اونٹ ہیں وہاں گھوڑے بھی تو ہیں۔ جن کی اصالت و نجابت و شرافت ضرب المثل ہے کہ وہاں کے گھوڑے مالک کیساتھ ایسے وفادار ہوتے ہیں جن کو سب جانتے ہیں (لڑائی میں جہاں عربی گھوڑا دیکھتا ہے کہ میرا مالک زخمی ہوکر گرا چاہتا ہے تو اس وقت دشمن پر حملہ کرکے اور مالک کے پاس سے لوگوں کو ہٹا کر میدان سے اس کو لے بھاگتا ہے) اگر یہی طریقہ استدلال ہے تو گھوڑوں کی ان صفات حمیدہ سے بھی تو اہل عرب کے کمالات پر استدلال کرنا چاہیئے تھا۔ مگر کچھ نہیں۔ آجکل لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ اہل عرب کی جہالت و وحشت کو بہت ہی غلط اور بدنما بھدے عنوانوں سے بیان کرکے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ثابت کرتے ہیں کہ آپ نے ایسے جاہلوں کی اصلاح کی۔ ایسے وحشیوں کو متمدن بنایا۔ ان لوگوں کی نیت تو بہت اچھی ہے مگر نہایت بُرا ہے

اہل عرب کا حال

اول تو بات اتنی کہنی چاہیئے جتنی اصلیت ہو۔ اہل عرب میں حضورؐ کی بعثت سے پہلے جہالت و وحشت ضرور تھی، مگر نہ اتنی جتنی یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ پھر جتنی جہالت تھی اس کے ساتھ ان کے کمالات و صفات حمیدہ کو بھی تو بیان کرنا چاہیئے جو ان میں زمانہ جہالت میں تھیں۔ اہل عرب میں ہمیشہ سے شجاعت کا جوہر موجود تھا۔ زبان کے بڑے پکے تھے۔ جھوٹ بولنا جانتے ہی نہ تھے۔ مہمان نوازی اور سخی نمبر اول تھے۔ اور ایک بات تو ان میں ایسی تھی کہ جو دنیا کی کسی قوم میں بھی نہ تھی وہ یہ کہ جب دشمنوں کے ساتھ اپنے مقابلہ اور لڑائی کا ذکر کرتے ہیں تو دشمن کی شجاعت و بہادری کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے بہادر ایسے کریم دلیر تھے حتیٰ کہ کبھی مقابلہ میں پسپا ہوتا بھی ذکر کردیتے ہیں غرض دشمنوں کی تعریف کرنا یہ اہل عرب کی خاص صفت ہے اس پہلو کو بھی بیان کرنا چاہیئے تاکہ ناظرین و سامعین کو اہل عرب سے نفرت نہ پیدا ہو۔ ان کی نظروں میں یہ قوم ذلیل نہ ہو مسلمان کا دل اس بات کو کیسے گوارا کرسکتا ہے کہ اپنے نبی کی قوم کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل وحقیر کرے اور اس طرح ان کا ذکر کرے جس سے قلوب میں ان سے نفرت پیدا ہو۔ جیسا سر سید نے کیا۔ اس لئے مولانا محمد علی کو غصہ آیا اور اس کا خوب جواب دیا۔ خدا ان کو جزائے خیر دے

(العبرۃ بذبح البقرۃ ص ۶۹)

۴۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح فرمانے کی حکمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح مصالح کیوں نہ ہوتیں۔ عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں۔ حضور کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے جس میں ایک کام تو آپ کا ہے یعنی پہونچا دینا۔ اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے، جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا۔ پس یہ حال ہوجاتا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے — تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے۔

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ رہتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ پوچھوں گا۔ صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔

ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں ؎

یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آجاتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا۔

اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے گاہے گاہے مزاح فرمایا کرتے تھے تاکہ ان کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہوکر استفادہ کرسکیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ ہوگی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامانِ غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایکمرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جارہے تھے کہ دفعۃً پیچھے مڑکر دیکھا تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ حالانکہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر کے مرید نہ تھے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پیر بھائی تھے، جن میں گونہ مساوات ہوا کرتی ہے مگر ان پر بھی آپ کا اس قدر رعب تھا۔

مگر شاید اس میں کوئی یہ شبہ نکالے کہ وہ حضرات تو معتقد تھے تو سنئے کہ غیر معتقدین پر آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایکمرتبہ سفیر روم بڑی شان و شوکت کے ساتھ مدینہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہوکر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے ؎

گفت کو قصر خلیفہ اے چشم — تا من اسپ و رخت را آنجا کشم

قوم گفتندش کہ او را قصر نیست — مر عمر را قصر جاں روشنیست ۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ

(اس واقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہوگیا مگر بہت ضبط سے کام لیا) لوگوں نے کہا کہ عمر کے لئے نہ قصر ہے نہ ایوان ہے بس اس کا دل ہی قصر و ایوان ہے ۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کانپتے ہیں ۔ اسکے نہ محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے پھر اس نے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں لوگوں نے کہا کہ مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں تلاش کرلو کہیں مل جائیں گے ۔ اب وہ آپ کی تلاش میں نکلا ۔ معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے ۔ سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس ۔ آخر وہ جنگل کی طرف چلا ۔ جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا جہاں حضرت عمرؓ پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اسکے دل پر ہیبت و رعب نے غلبہ کیا کیونکہ جنگل میں ایک خدا کا شیر پڑا ہوا تھا اور قاعدہ ہے جہاں شیر پڑا ہوتا ہے اس جنگل میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں ۔ اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ چوکی ہے نہ جاہ و حشم ہے نہ ساز و سامان ہے پھر یہ کیا بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہونچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر ۔ سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کی بجائے رکھی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر، بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں ۔ اس حالت کا مقتضا یہ تھا کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا ۔ جونہی نظر پڑی ہے پر اٹھانے کی ہمت نہ رہی ۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب و داب کے ہزار سامان ہوتے تھے ۔ مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا ۔ آج کیا بات ہے کہ اس بے سر و سامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے ۔ آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہوگیا ؟ بیشک ہے

ہیبت حق است ایں از خلق نیست — ہیبت آں مرد صاحب دلق نیست

یہ خدائی رعب و جلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا بالآخر سفیر روم کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمر کو خود جگائے وہ تو اپنی جگہ پر دیر تک کھڑا کانپتا رہا ۔ کچھ دیر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور تسلی دی ، جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی حضرت عمر کی باتیں سننے کے بعد ہیبت مبدل بہ محبت ہوگئی ۔ اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق پر ہے ۔ پھر وہ اسلام سے مشرف ہوگیا ۔

یہ تو حضرات صحابہ کی حالت تھی ۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کو ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی ۔

حضرت گنگوہیؒ کا دبدبہ

حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے رعب و ہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا سے بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے ۔ حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور جھجکتے اور ڈرتے تھے ۔ اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لئے ڈرتے ہیں کہ وہ غصیارے ہوتے ہیں بات بات میں ان کو غصہ آجاتا ہے اسی لئے ان کے پاس جاتے ہوئے کانپتے ہیں ۔ جیسے مولانا فضل الرحمن تھے ۔ یا آجکل بھی ایک بدنام ہے ع

(ہائے ہزار نام فدائے تو بدنامی تو) (جامع)

مگر مولانا گنگوہیؒ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا ۔ میں نے کبھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا ، مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا ۔ اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لئے مانع فیض ہو جاتی ہے اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام اپنے اصحاب سے گاہے مزاح کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت و محبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہو جائے ۔

(الاسعاد والابعاد ص ۳۰)

۴۲ - اس شبہ کا جواب کہ تقدیر کس طرح بدل سکتی ہے

حضرت مجددصاحب قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانے میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا مگر حضرت صاحب کو ان کی بابت مکشوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا۔ بس حضرت مجددصاحب دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے۔ آپ کے دل کے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اس لئے دعا کرنا چاہی۔ مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر مکشوف ہونے کے بعد اسکے خلاف کی دعا کرتا ہے مگر پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر شقی کو سعید کرا سکتا ہوں۔ اس پر مجددصاحب کی بھی ہمت ہوئی۔ معلوم ہوگیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں۔ چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لیے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ آپ کو مکشوف ہوگیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا تب آپ کو چین آیا۔

تو دیکھئے! مجددصاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا۔ مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی۔ اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہے راتوں کی نینداس کی اڑ گئی ہے۔

خیر واقعہ تو ہوگیا مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی۔ جس کے متعلق ارشاد ہے **مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ** حضرت مجدد نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے اور واقعہ میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الٰہی میں ہوتی ہے تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا مگر علم الٰہی میں اس کے ساتھ ایک قید بھی یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لئے دعا نہ کرے۔ سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیونکہ اصل میں تقدیر علم الٰہی کا نام ہے۔ اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل کبھی نہیں ہو سکتا۔ پس دراصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحو والاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے، کیونکہ لوح محفوظ

میں اتنا تغیر و تبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحو والاثبات میں ہوتا ہے مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہو سکتا ہے اور ہو جاتا ہے اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجے میں ہے اس میں اس کا اصلاً احتمال نہیں۔ پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے اور اس تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجے میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے کیونکہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں **وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم**۔ یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے۔ یہ غایت قرب لدی کا مدلول ہے اور غایت ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے حکیم ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلامِ نفسی ہے اور اس لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدینا اور علی دونوں کو دلالت اسکے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی۔ اور اس سے قبل جو ارشاد ہوا ہے۔ **انا جعلنا قرآنا عربیا** اس میں اس کے فعل کا مفعول ہونا اور عربیۃ کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اس سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے تو دونوں آیتوں میں دونوں درجہ کا بیان نہایت وضاحت سے ہوگیا۔

(الاسعاد والابعاد ص۱۵)

۴۳ - فلسفہ اور تعلیم انبیاء علیہم السلام میں فرق

تمہارا فلسفہ ایسا ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کر لیا اور اخیر میں نتیجہ کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ اشراقین کی یہ رائے ہے اور مشائیین کی یہ رائے ہے۔ معلوم نہیں کون غلط ہے اور کون صحیح ہے۔ اور ہمارے علم یہ ہے کہ اول ہی دن ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کر دیا۔ اسی وقت سے حاصل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی امید ہوئی۔ اور تمہیں کیا ملا۔ کون سا ثواب مشائیین اور اشراقیین کی رائے پر ملنے کی امید ہے۔ بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کس قدر مباحثات اور مناظرات ہیں۔ ایک ذرا سی بات ہے وہ طے ہی نہیں ہوتی۔ خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھر دیئے۔ اور اس پر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں دقیق بیشک ہیں۔ مگر اس وقت کا حاصل کیا ہے؟ اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اس کو حاصل کر کے کوئی نتیجہ معتد بہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہاں حاصل کے نام صفر ہے۔ تمام عمر اس لوٹ پوٹ میں رہے کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے اور طے جب بھی نہ ہوا کہ کیا

ٹھیک ہے۔ اور اگر طے بھی ہوجائے کہ امرِ حق یہ ہے تب بھی اس کا حاصل کچھ نہیں صرف ایک بات کا علم ہوگیا۔ اس سے کام کون سا نکلا۔

علم معقول

دیکھئے معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اس میں اس قدر مناقشات ہیں کہ انکی وجہ سے اس بحث کو معرکۃ الآرا ٹھیرالیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اس پر بحث ہے کہ علم کون سے مقولہ سے ہے یہ ذرا سی بات ہے مگر لوگوں نے اس میں کتابیں کی کتابیں سیاہ کردی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافت سے ہے، کوئی مقولہ کیف سے بتلاتا ہے۔ پھر سب طرف وہ حجتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں کہ الٰہی توبہ، دماغ پریشان ہوجاتا ہے، اور نیتجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں۔ اگر تحقیق ہوگیا۔ اور امر واقعی معلوم ہوگیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے تو ثمرہ علم کا تو نہ بدلا۔ یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہے چاہے علم کسی مقولہ سے ہو۔ اور اگر تحقیق نہ ہوا اور امر حق معلوم نہ ہوا تب بھی ثمرہ نہ بدلا۔ یعنی جو نتیجہ اس علم سے ہونے والا ہے وہ اب بھی مرتب ہوگا بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھاویں یا کوئی معجون کھاویں تو اس کی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں اس ترکیب کا ہم کو علم ہو یا نہ ہو منفعت پھر بھی حاصل ہوگی۔ لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں باورچی پکاتا ہے اور کھالیتے ہیں اس کی لذت اور منفعت جو اس پر مرتب ہے برابر حاصل ہوتی ہے حالانکہ ترکیب کسی کو نہیں آتی بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ جس کو ترکیب آتی ہے یعنی باورچی وہ پلاؤ کے نیتجہ سے اکثر محروم رہتا ہے کیونکہ اسے پلاؤ کھانیکو نہیں ملتا۔ نیتجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے اور پکاتا وہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ علم باورچی ہے اور ثمرہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے عالم صاحب ثمرہ سے محروم ہیں۔ اب فرمائیے کہ علم اچھا، یا ثمرہ؟ یہی حال علوم حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے کہ ان کے پاس صرف علوم ہی میں اور انہوں نے ان کو منتہائے نظر قرار دے رکھا ہے اور ثمرہ حاصل ہے۔ شرعیات جاننے والوں کو انبیاء علیہم السلام نے تو غذا پکی پکائی دی ہے اور حکماء نے پکانا سکھایا ہے مگر انہوں نے جس چیز کا پکانا سکھا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں محض سونگھنے کی ہے۔ دن بھر تو سر مارا جب چیز تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانے کی نہیں ہے۔ ؎ ع

ع "چوں دم برداشتم مادہ برآمد"

اور یہ میں بالکل غلط نہیں کہتا ہوں کہ ان کی بتلائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو انہوں نے تمام عمر سر مار کے طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں۔

تعلیم انبیاء کرام

اب دیکھ لیجئے کہ وہ کارآمد ہیں یا نہیں۔ جب غلط ہیں تو کارآمد کیسی؟ تو یہ بات صحیح ہوئی کہ جو چیز انہوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ نکلی۔ خلاصہ یہ کہ تعلیم انبیاء علیہم السلام کی سہل ہوتی ہے کیونکہ وہ فضول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے، کام میں لگانا چاہتے ہیں، ان کو خلق خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اور اپنی بڑائی جتانا منظور نہیں ہوتی بتا تو سہولت تعلیم انبیاء کی یہ ہے یعنی شفقت۔ لیکن نیتجہ اس سہولت کا یہ ہوا کہ عام فہم ہونیکی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا ہے یہ بڑی نادانی ہے۔ (الباطن صہ۵)

۴۴ - نوتعلیم یافتہ کو ظاہری اصلاح کے ساتھ باطن کی صفائی بھی ضروری ہے

آجکل دین کی طرف سے ایسی لاپروائی ہے کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے۔ الٹا ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو دین کا نام لیتے ہیں اور کس قدر دین سے بعد کی دلیل ہے۔ اور اگر کسی خیال دین کی طرف ہے بھی تو ظاہری اصلاح کا نام دین رکھ لیتا ہے۔ نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں۔ وضع قطع مسلمانوں کی سی بنائی۔ بس اس کا نام دین ہے ان کی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہنچتی تو ان امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں تو اس خفا کی وجہ سے ان میں اور دشواری پیدا ہوگئی تو اب سمجھئے کہ یہ امر کس قدر قابل توجہ ہوئے پس اس حدیث قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لایستجیب الدعاء عن قلب میں انکی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان تمام امراض کی ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کس قدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ دین کے دو جز ہیں۔ ظاہری، باطنی۔ اب تو یہ حالت ہے کہ باطن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہے۔ باطن کی جگہ بطن لے لیا ہے۔ بس پیٹ بھر لیا جائے جس طرح بھی ہو۔ حلال سے ہو یا حرام سے دھوکہ سے ہو یا اشراف نفس کے ساتھ ہو، بلاطیب خاطر ہو یا جبر سے ہو۔ جس طرح سے بھی مل جائے لقمہ حاصل کرلیا جاوے ہاں بیشک ظاہر کو بعض

نے درخواست کرلیا ہے اور بس ۔

اور اس میں بھی دو فریق ہیں ۔ ایک تعلیم یافتہ، اور ایک عوام، عوام تو اس بارے میں اقراری مجرم ہیں خود اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین، الٹی سیدھی ٹکریں مار لیتے ہیں ۔ دل دنیا میں لگا ہوا ہے کسی وقت خدا کی یاد دل میں آتی ہی نہیں ۔ خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں اپنے قصور کا

دوسرا گروہ جو تعلیم یافتہ ہے ان پر زیادہ افسوس ہے کہ اپنے قصور کے بھی مقر نہیں ۔ انکو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جزو بھی ہے ۔ عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں وہ محض ظاہری ہے اور باطن سے ہم محروم ہیں ۔ اور تعلیم یافتہ لوگ محروم ہونے کا نام بھی اپنے اوپر آنے نہیں دیتے کیونکہ شان میں فرق آجائے گا انہوں نے باطنی جزو کو دین سے اڑا ہی دیا ۔ بس ظاہر پر کفایت کرلی اور اسپر ناز کرنے بیٹھے اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں ۔ اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے بعض اجزاء کو، گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزاء نکال دیئے ہیں ۔ اسکے یہ معنیٰ ہیں کہ دوسرے اجزاء نعوذ باللہ فضول اور زائد ہیں اور وہ انتخاب کن اجزاء کا کیا ہے جن میں سہولت ہے یا جنکی عادت ہو گئی ہے جیسے نام مسلمانوں کا سا رکھ لینا ۔ صورت مسلمانوں کی سی بنا لینا ۔ بس انہیں اجزاء کا نام دین سمجھ لیا ہے ۔

دین کے اجزاء

صاحبو! دین کے اجزا تو ہیں عقائد، اعمال، معاشرت معاملات، اخلاق ۔ ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے اب یہ حالت ہے کہ ان اجزاء میں سے بعضوں کا تو نام سن کر بھی چونکتے ہیں ۔ اور تعجب کرتے ہیں ۔ بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ ان کو دین سے کیا تعلق ۔ معاشرات بھی دین سکھلانے کی چیزیں ہیں ۔ یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے آدمی خود سیکھ جاتا ہے ۔ اس میں بھی مولویوں نے پابندیاں لگا دی ہیں ۔ علیٰ ھذا معاملات میں بھی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں ۔

غرض بعض اجزاء کو دین کا جزو ہی نہیں سمجھا جاتا ۔ برے اعمال دیانات تک رہ گئے ہیں اور وہ اعمال بھی سب نہیں ۔ ان میں سے بھی وہی لئے ہیں جن کی ایک رسم چلی آتی ہے اور جن کی بچپن سے عادت پڑ گئی ہے ۔ چنانچہ بڑی دیانتداری ہے کہ نماز پڑھ لی، ڈاڑھی رکھ لی، شرعی پاجامہ پہن لیا، گوشت کھا لیا ۔ صورت، شکل، وضع مسلمانوں کی سی بنا لی، یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں ۔ اور جو اپنے آپ دیندار بھی نہیں کہتے ان کا تو

یہاں ذکر ہی نہیں ۔

غرض دین کے اجزاء میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی گویا جوہر نکل آیا اور دین نام رہ گیا گنتی کے صرف چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کے چند شعبوں کو درست کرلیا ۔

غرض اس انتخاب میں بھی جو رہا وہ ظاہر ہی رہ گیا اسکے سوا دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا بس اس ناتمام ظاہر کو بنا کر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں ۔ اس بیان ظاہر کو بگاڑنے والے خوش نہ ہوں کہ ہم تو دیکھئے باطن پرست ہیں ۔ مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں باطن کا درست ہونا کافی ہے ظاہر کے درست کرنیکی ضرورت نہیں ۔ بلکہ ان کے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مخل ہے ۔ لہٰذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں کہ یہ بھی نہیں پہچانا جاسکتا کہ یہ بھی مسلمان ہیں ۔ وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے ۔ یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہو جائے گا ۔ اس سے ہمارے نفس کو خوشی ہوگی تو یہ نفس پروری ہوئی ۔ اس قسم کی بہت سی خرافات من سمجھوتہ کرنے کے لئے گھڑی ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے ۔ میرے ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا کہ یہ لوگ خوش ہوتے ۔ اس لئے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا بلکہ اسپر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں تاکہ وہ اصلاح باطن کی فکر کریں ۔ محض اصلاح ظاہر پر قناعت نہ کریں باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے اس لئے کسی کو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاح ظاہر کو ترک کر دے گو بالفرض باطن بھی درست ہو ۔ اور ان بددینوں کا تو باطن بھی درست نہیں بلکہ انہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے، ظاہر کو تو بگاڑا ہی ہے باطن کو بھی بگاڑا ہے اور یہ اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے ۔ اس سے بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا ایک ہی فرض ادا ہوتا

باطن کی اصلاح

اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جاوے کہ ہم اس کو نہیں مانتے کہ ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے، باطن ہمارا بالکل اچھا ہے ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لئے بگاڑا ہے اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہے ۔ پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہوا کہ انہوں نے باطن اور ظاہر دونوں کو بگاڑ رکھا ہے ۔ میں بطور الزامی جواب کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر ہر حکم مخالفت کرتا ہے اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا لیکن جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو کیوں کرتا ہے تو کہتا ہے کہ وہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیر خواہ ہوں یہ جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف عجب سے بچنے کے لئے کر رکھی ہے تاکہ

میرے خلوص میں فرق نہ آوے۔ بتائیے آپ اس کو کیا کہیں گے۔ یہی کہیں جھوٹا بدمعاش غلط کہتا ہے فرمائیے اس کی کیا وجہ ہے۔ جب ایک شخص اپنے زبان سے کہہ رہا ہے کہ میں دل سے مطیع ہوں اور خیر خواہ ہوں تو آپ اس کو جھوٹا کیوں کہتے ہیں اور اس کو باغی کیوں سمجھتے ہو۔

اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اس کی وجہ سوا اسکے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے۔۔۔۔ باطن کا۔ جب افعال افعال اسکے مخالف نہ ہیں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کرسکتا کہ باطل اس کا موافق اور مطیع ہے اور یہی کہا جائے گا کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باغی ہے۔ اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ اس کا باطن درست ہو اور ظاہر میں اس کا اثر نہ پیدا ہو۔ سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو اور بدون اضطرار کے ظاہر اس کا مخالف ہو۔

یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آگئی۔ اصل بیان یہ تھا کہ آجکل بہت سے دیندار ایسے ہیں۔ جنھوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ رکھا ہے۔ پھر اعمال سے مراد اعمال ظاہری لئے گئے ہیں وہ بھی بہت نہیں بلکہ معدودے چند، جیسے ڈاڑھی بڑھائی نماز پڑھ لی۔ وضع قطع درست کرلی اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہوگئے۔

اس تقریر سے چونکہ یہ شبہ ہوسکتا تھا کہ ظاہر کو بنانا کچھ اچھی چیز نہیں اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں۔ اس لئے انکی غلطی کو بیچ میں رفع کر دیا گیا۔ باقی اصل خطاب انہیں لوگوں کو ہے جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھتے ہیں۔ اور جن کو اپنے مرض کی خبر نہیں۔ اور وہ مرض ہے بھی ایسا جس کی خبر ہونا دشوار بھی ہے اور جب خبر ہونا دشوار ہے تو اس کی اصلاح بھی دشوار ہے۔ خبر کے دشوار ہونیکی وجہ یہ ہے کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے لہٰذا خبر بھی آسانی سے ہوگی اور اصلاح بھی اس کی آسان۔ ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے بخلاف مرض باطن کے کہ اس کے مریض کو اس کی اطلاع تک بھی نہیں ہوتی پھر اصلاح کیسے ہو اور جب اس مرض کی مریض کو بھی خبر نہیں ہوتی تو دوسروں کو تو کیسے خبر ہوتی۔ کیونکہ وہ دوسروں کو نظر تو نہیں آتا۔ اور بدگمانی کی کسی کو تو اجازت تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے۔ لہٰذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا۔ پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے کیونکہ اطلاع مفقود اور وہی شرط علاج اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے تو اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے توجیہ اور تاویل کا کہ اس کو کھینچ کھانچ مرض کی حد سے نکال لیں گے اور ناجائز کو

جائز بنالیں گے حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہے تو اس تاویل سے ہرگز بشاشت نہیں ہوگی۔ بلکہ قلب میں اسی کا اقرار رہے گا کہ یہ گناہ ہے پھر جب خود ہی کو گناہ ہونیکا علم ہے تو اللہ تعالیٰ کو کیسے علم نہ ہوگا تو پھر اس توجیہ اور تاویل سے کیا کام چلا، خدا کے سامنے تو گنہ گار ہی رہے ظاہر بینوں کی نظر میں سرخ رو ہوگئے تو کیا ؎

کہ ہمے اللہ دروغ می زنی	از برائے مسکہ دوغ می زنی
خلق راگیرم کہ بفریبی تمام	در غلط اندازی تاہم خاص وعام
کارہا باخلق آری جملہ راست	باخدا تزویر وحیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن	رایت اخلاص وصدق افراشتن

ظاہر کے بنانے سے دنیا تو دھوکہ میں اس واسطے آگئی کہ ان کی نظر صرف ظاہر تک ہے مگر باطن کو بگاڑ کر دھوکہ کیسے دے سکتے ہیں جبکہ ان کی نظر باطن تک بھی پہونچی ہے۔ دنیا کی نظروں کے سامنے تاویلیں کرکے سرخرو ہوگئے تو کیا ہوا، تاویل سے اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔ حق تعالیٰ کو تو اصل واقعہ کا علم ہے۔

تاویل کی خرابی

اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کی برائی پر پردہ پڑجاتا ہے۔ اصل گناہ تو مرض تھا ہی، یہ تاویل کا مرض اس سے بھی سخت ہے کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہوسکتی ہے کہ کبھی اس سے تنبہ ضرور ہوجائے گا اور جب تاویل درمیان میں آگئی تو گناہ کی برائی پر پردہ پڑگیا اب تنبہ ہو تو کیونکر ہو۔ اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ نہیں کرسکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے کوئی برائی اسکی نظر میں نہیں آتی اور خود تنبہ اس واسطے نہیں رہا کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑگیا۔ تنبیہ اور تنبہ سب اڑگئے اب اصلاح کی کیا امید ہو۔ دیکھئے کس قدر دشواری ہے باطن کی اصلاح میں۔

بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ اسمیں تاویل کی ضرورت نہیں۔ اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے۔ اسلئے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں۔ علم ہے عمل ہے۔ نماز ہے۔ روزہ ہے۔ جب اتنے کمال موجود ہیں تو وہ عیوب بھی صحیح، فیصلہ غلبہ

سے ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے اور برائی کم تو بھلائی ہی حکم ہوگا۔ اس صورت میں کسی تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اچھے بن گئے اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی، یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا اس سے بات بھی دہی کی وہی رہی اور دل کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ ہم اچھے ہیں یہ ایسی مدلل تقریر ہے کہ اس کا جواب دینا بھی مشکل ہے۔

اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پاوے مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ساتھ میں ہوگا۔ اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کرے گا اور اس روز دل کو سمجھا لینے سے کچھ کام نہ چلے گا اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپکا غالب تو مغلوب ہو اور مغلوب غالب ہو۔

دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے اور عیبوں کے دور کرنے کی جو اس کے اندر ہے۔

تو کیا اس دل کو سمجھا لینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگئی؟ ہرگز نہیں بلکہ جیسے تاویل سے ان عیبوں پر پردہ پڑگیا تھا اسی طرح اس فیصلے سے بھی پردہ پڑگیا، تاویل بھی ایک مرض تھا یہ بھی ایک مرض ہے۔ وہ ایک قسم کا پردہ وہ دوسری قسم کا پردہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہی ہے۔ اس میں اور اس میں اتنا فرق ہے کہ اس میں تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ تسلیم نہ کیا تھا اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا۔ اس تاویل میں اس سے بھی بڑھ کر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا۔ خیال کیجئے کہ یہ کس قدر گہری تاویل ہے

باطنی بیماری کا علاج

بہرحال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آگئی ہوگی کہ امراض باطن کا ادراک نہایت دشوار ہے کیونکہ اتنے موانع موجود ہیں۔ اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، جب اس کی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہوسکتا ہے جب مرض کی خبر ہو، اور جب خبر ہی نہیں تو علاج کیسا۔ اس دشواری کو دیکھ کر بعض لوگوں نے ہمت ہار دی کہ کون علاج کرے اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے۔ اللہ میاں بڑے کریم ہیں ہم گنہگار سہی اللہ میاں معاف کرنے والے ہیں۔ پھر کیوں مصیبت میں پڑے کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو۔ اس کے نخرے اٹھاؤ ہر وقت اسی ادھیڑبن میں رہو۔ اچھی خاصی مصیبت ہے۔ جب اللہ میاں رحیم و کریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت کو اٹھانے کی، وہ اپنی رحمت سے خود

ہی سب کام بنا دیں گے۔

یہ ان لوگوں کے خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں۔ اور کوئی کام خلاف شرع کرنا نہیں چاہتے۔ ان کے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے، روزے کی بھی ضرورت ہے ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے۔ مگر قلب کی طرف کبھی ان کو توجہ نہیں ہوتی کہ اس کے بھی کسی مرض کے اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں۔

پس سن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں اور ان کے دور کرنے کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے جیسا کہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا۔

(الباطن ص ۲۴ تا ۳۱)

۴۵۔ ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح ضروری ہے۔

ان نئے تعلیم یافتہ اصحاب کے خیالات بھی نئے ہیں۔ انہوں نے دین کا خلاصہ ایک نئے طریقے سے کیا ہے۔ یہ دعوی تو ان میں اور فقراء میں دونوں میں مشترک ہے کہ دین کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اور مقصود اعظم باطن ہے۔ ظاہر کی چنداں ضرورت نہیں اور آگے اس بات میں دونوں متمائز ہیں کہ وہ باطن کیا ہے کہ فقراء نے تو ہر عمل کا باطن الگ نکالا ہے۔ نماز کا الگ روزہ کا الگ اور حج و زکوٰۃ کا الگ جیسا کہ بیان کیا گیا۔ اور ان ابرار نے اس سے بھی زیادہ اختصار کیا ہے۔ گویا اس کی صنعت بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ انہوں نے ست کا بھی ست نکالا۔ یہ مولویوں اور فقراء کو سب کو فضول سمجھتے ہیں۔ انہوں نے کل دین کا خلاصہ ایک ہی چیز کو نکالی ہے وہ کیا ہے؟ تہذیب، اخلاق، بس تمام اعمال تو دین کے لئے ظاہر ہیں اور باطن دین کا اور حقیقت اس کی تہذیب، اخلاق ہے۔ اور کھلے الفاظ میں کہتے ہیں کہ اٹھک بیٹھک اور مال کا خرچ کرنا اور پیٹ کاٹنا جس جس عمل کو عبادت کہا جاتا ہے وہ سب بانی اسلام علیہ السلام نے صرف اس واسطے تجویز فرمائی تھیں کہ تہذیب اخلاق حاصل ہو بلکہ عرب وحشی ملک تھا اور وہاں بہیمیت بہت زیادہ تھی ان کی

اصلاح بلا اس سخت گیری کے ہو نہیں سکتی تھی اس واسطے یہ احکام تجویز کئے گئے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ریفارمر تھے ۔ انکی اصلاح کے لئے ایسی صحیح تدبیریں تجویز فرمائیں کہ ان سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی تھیں اور ہمکو وہ بات بدون نماز روزہ کے حاصل ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اصلی تھا یعنی تہذیب اخلاق ۔ کیونکہ ہم تعلیم یافتہ ہیں اور یہ بہت عرب کی سی ہم میں نہیں ہے تو واسطے اس سخت گیری کی کیا ضرورت ہے اور یہ بڑی نادانی ہے کہ متکلم کی اصل غرض کو نہ سمجھا جاوے اور صرف الفاظ پر رہا جاوے ۔ جیسا کہ خشک مولوی کر رہے ہیں ۔ کیوں صاحب کیا دلیل ہے اس بات کی کہ تمام احکام سے مقصود اصلی خطرہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف تہذیب اخلاق ہے ۔ کوئی دلیل اس پر ہونی چاہیئے ۔ اور میں دور کی بات کہے دیتا ہوں کہ اول تو دلائل عقلیہ سے اس کا احتمال بھی منفی ہے لیکن بفرض محال اگر اس کا احتمال بھی ہو کہ شاید یہی مقصود ہو تو صرف احتمال پر اس دعوے کی بنا رہوئی دلیل پر تو بنا رنہ ہوئی تو کیوں صاحب ایک دین ہی آپ کے نزدیک ایک ایسی چیز ہے کہ جس میں اپنے مطلب کے لئے احتمال ہی پر بنا رکرکے اس سے تسلّی کرلی جاتی ہے کبھی دنیا کے بھی کسی کام کی بنا ر آپ کوئی عقلمند صرف احتمال پر کیا کرتا ہے ۔ مثلاً ایک بہت بڑا مہاجن ہو ۔ جس کے یہاں بہت دولت ہو وہ مرجاوے تو آپ اسکے یہاں جاکر کہیں کہ اسمیں سے مجھے بھی حصہ ملنا چاہیئے کیونکہ میں اس کا بیٹا ہوں اور کوئی کہے تم بیٹے کیسے ہو تو جواب دیجئے کہ احتمال تو ہے کہ میں اس کا بیٹا ہوں اور جب میں دعویٰ کرتا ہوں کی میں بیٹا ہوں ، لہٰذا میراث ملنی چاہیئے ۔ کیوں صاحبو ! کیا یہ بات چل جاوے گی اور کیا اس کو سن کر کوئی پاگل نہ کہے گا ؟ یا مثلاً جو آپ کا بیٹا ہے اس کو آپ میراث سے محروم کرنا چاہتے ہیں اس طرح کہ گو اس کا بیٹا کہا جاتا ہے مگر احتمال تو ہے کہ بیٹا نہ ہو لہٰذا اسی شق کو ترجیح دی جاتی ہے کہ بیٹا نہیں ہے اور میراث سے محروم ہونا چاہیئے تو کیا یہ بات مان لی جاوے گی ؟

دین سے بے رغبتی

صاحبو ! تعجب ہے کہ دنیا کے تو کسی معمولی کام کی بنا ر بھی احتمال میں نہیں کرتے اور دین کے بڑے بڑے کاموں میں جرأت کرتے ہیں ۔ اور تغیر کر ڈالتے ہیں ۔ دنیا میں تو یہ حالت ہے کہ احتمال کے موقع پر ہمیشہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاتا ہے ۔ مثلاً کسی دوا میں شک ہوجائے کہ یہ دوا فلانی ہے یا کوئی تیزاب ہے تو اس کو کوئی بھی نہیں لے گا ۔ بلکہ اسی کو پسند کریں گے کہ اس کو تلف کر دیا جائے گو کتنی ہی لاگت اس میں صنائع ہوتی ہو اور اس کو مکان میں رکھنا گوارا نہ کریں گے

اسی احتمال کی وجہ سے کہ کوئی پی نہ جاوے اور نقصان ہوجائے ۔ یا اللہ ! دین ہی کیا ایسی سستی اور بیکار چیز ہے کہ اسے بالکل سر پر سے اڑا دینے کے لئے صرف احتمال کافی ہے ۔ تمام ارکان دین بدل ڈالا صرف اس احتمال پر کہ شاید مقصود ان سب سے تہذیب اخلاق ہو اور لطف یہ ہے کہ یہ احتمال بھی مرجوح بلکہ غلط اور اپنا تراشا ہوا اور زبردستی کا احتمال ہے کیونکہ احتمال تو وہاں ہو سکتا ہے جہاں متکلم کی طرف سے کوئی بیان نہ ہو ۔ یہاں تو صاحب شرع کی طرف سے صاف صاف بیان موجود ہیں ۔ ہر ہر عبادت کی کیفیت اور اس کے کرنے کی ضرورت اور اس پر ثواب اور ترک پر وعیدیں بیان فرمائی ہیں ۔ پھر یہ احتمال بھی کہاں رہا کہ شاید مقصود تہذیب اخلاق ہی ہو ، یہ تو کھلی ہوئی توجیہ القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ ہے اور یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے ایک نوکر سے کہیں کہ انگور لے آؤ اور وہ آٹا لے آوے اور کہے کہ مقصود تو کھانے سے تغذیہ بدن ہوتا ہے اور وہ انگور میں اتنا نہیں ہے جتنا آٹے میں ہے ۔ کیا یہ حرکت اسکی نافرمانی نہیں ہے ۔ حالانکہ وہ ایک معقول وجہ بیان کرتا ہے مگر جواب میں اس کے یہی کہا جاویگا کہ تو اپنی طرف سے غرض اور مقصود کو تراشنے والا کون ہے ۔ کیا دلیل ہے اس بات کی کہ اس وقت ہم کو مقصود تغذیہ بدن ہے ممکن ہے کہ تفکہ مقصود ہو جس کے لئے انگور موضوع ہے نہ آٹا خصوصاً جب یہ صورت ہو کہ تغذیہ مقصود نہیں ۔ مثلاً کھانے کا وقت نہ ہو یا ابھی کھانا کھا چکے ہوں یا گھر میں کوئی بیمار موجود ہو جس کو طبیب نے انگور کھانے کے لئے کہا ہو تو اس کا آٹا لے آنا اور زیادہ سخت بیوقوفی اور بدتمیزی ۔ بلکہ گستاخی اور لعنت سمجھا جاوے گا ۔ حالانکہ اس قرینے کے ہوتے ہوئے وہ احتمال باقی ضرور رہتا ہے ۔ لیکن ایسے نوکر کو کان پکڑ کر نکالدیا جاوے گا ۔

بس یہی قصہ دین کا سمجھو کہ جب دین میں قرائن اس بات کے موجود ہیں کہ خود اعمال بھی مقصود ہیں تو اپنی طرف سے ایک احتمال نکال کر ان کو بدلنا کیسے جائز ہوگا ۔ اور یہ قرائن اگر معمولی بھی ہوتے تب بھی اس اختراع کی گنجائش نہ تھی چہ جائے کہ تصریحات قولی موجود ہیں اس وقت میں تو اس اختراع کی مثال بالکل یہ ہوگی کہ نوکر سے کہیں انگور لے آ ، اور جواب میں کہے ۔ جی ہاں میں سمجھ گیا ۔ آپ کا یہ مطلب ہے کہ انگور لانا بلکہ آٹا لانا ۔

دین کی اہمیت

اے اللہ ! عقلیں کہاں چلی گئیں یا عقل اس واسطے ہے کہ دنیا کے کام بنائے جائیں ۔ اور دین کا نام آتے ہی اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور دین کے کاموں کو جان جان کر بگاڑا جاوے دنیا کے کاموں میں تو ذرا سا احتمال جو عیر ناسی عن دلیل بھی ہو پیدا ہوجاوے تو احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے ۔ اور دین کے

کاموں میں ایک غلط احتمال اپنی طرف سے تراش کر اس پر عمل کر لیا جاوے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ دین کو صرف ایک غیر ضروری چیز سمجھا ہے جس کا مقتضا یہ ہے کہ یوں کر لیا تو کیا اور یوں کر لیا تو کیا۔ ورنہ اگر ذرا بھی وقعت دین کی قلب میں نہ ہوتی اور اسکی کچھ بھی ضرورت سمجھی جاتی اور درجۂ وہم میں بھی یہ بات ہوتی کہ قیامت آنے والی ہے اور باز پرس ہوگی اور وہاں ایسی ایسی ہولناک تکلیفیں اور عذاب ہیں تو اول تو یہ احتمال پیدا ہی نہ ہوتا اور پیدا بھی ہوتا تو پہلو احتیاط ہی کا اختیار کیا جاتا اور یوں کرتے کہ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اعمال کا یہ خاص باطن (یعنی تہذیب الاخلاق) مقصود ہو (گو یہ ان کا خود تراشیدہ ہے) مگر بہتر یہی ہے کہ احتیاط کا پہلو اختیار کیا جاوے اور ظاہر کو بھی ترک نہ کیا جاوے۔ کیونکہ اگر وہ احتمال غلط نکلا تو قیامت میں کیا جواب ہوگا (دیکھئے مال گذاری داخل کرنے کو تحصیل میں جاتے ہیں اور فرض کیجئے کہ بیس روپئے مال گذاری کے داخل کرنے ہیں لیکن اگر شک پڑ گیا کہ کچھ آنہ پائی۔ اس رقم کے اوپر اور بھی ہیں تو اس صورت میں جیب میں پچیس روپئے ہی ڈال کر چلیں گے اس خیال سے کہ کچھ تو کسر مال گذاری میں ہے جس کی مقدار معلوم نہیں اور شاید کوئی روپیہ کھوٹا بتا دیا جاوے یا عملہ والوں ہی کو کوئی حق رشوت یا حق کا دینا پڑے تو احتیاط یہی ہے کہ پانچ روپئے زائد لے چلیں۔ اگر خرچ نہ ہوئے تو واپس آجاویں گے۔ اور اگر نہ لے چلے اور وہاں کمی پڑ گئی تو ذرا سی بات کے لئے آبرو پر بن جاوے گی۔ ایسے موقعوں پر دنیا میں بیوقوف سے بیوقوف بھی احتیاط ہی کا پہلو اختیار کرتا ہے) پھر تعجب ہے کہ دین میں وہ لوگ جو اہل عقل ہونے کے اور تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں احتیاط کا پہلو اختیار نہیں کرتے بلکہ ایک من گھڑت احتمال پر قطعی حکم کر دیتے ہیں اور ایسے بے فکر ہوجاتے ہیں کہ دوسری جانب کا (جو درحقیقت راجح اور یقینی ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ محتمل جانب مرجوح بلکہ غلط ہے) ان کو احتمال ہی نہ ہوتا۔ اسکی وجہ صرف دین کا غیر ضروری سمجھنا ہے۔ بس اس کا آخری جواب ہمارے پاس یہی ہے کہ آنکھ میچتے ہی معلوم ہو جاوے گا کہ کس دھوکہ میں رہے اور اس وقت کا تدارک کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔

امراء کا حال

غرض اس امراء کے فرقے نے بھی دین کا ایک ست نکالا اور یہ ست اس ست سے بڑھا ہوا ہے جو فقراء نے نکالا تھا۔ کیونکہ فقراء نے جو ست نکالا ہے وہ ایک دین کی چیز تو ہے اور انہوں نے ست بھی دنیا ہی کی ایک منفعت نکالی ہے پس وہ ست تھا اور یہ روح ہے آجکل ہر چیز کی روح نکالی گئی ہے۔ گلاب کی روح الگ ہے چنبیلی کی روح الگ ہے۔ انہوں نے یہ روح نکالی ہے۔ (روح کیا نکالی کہ دین کی روح ہی نکالدی) تمام دین کی روح ایک ذرا سی نکالی جس کا نام تہذیب اخلاق رکھا ہے۔ اس کو

(اور وہ بھی اپنے ہی نزدیک حاصل کر لیا ہے۔ بس کسی عمل کی ضرورت نہیں اگر کوئی کیا بھی تو دنیا کے فائدے کے لئے۔ مثلاً نماز پڑھی تو اس فائدے کی بنا پر کہ ان حرکات سے جسم کی ریاضت ہوجاتی ہے اس واسطے کبھی اٹھک بیٹھک کر لیتے ہیں اور کبھی اور طرح کی ریاضت ہوگئی مثلاً گھوڑے کی سواری کر لی یا کرکٹ اور فٹ بال کھیل لیا تو اب ریاضت کی ضرورت نہیں رہی، بس نماز حذف، یا ایک نماز کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے واسطے وضو کیا جاتا ہے جس سے صفائی ستھرائی ہوجاتی ہے اور صفائی اچھی چیز ہے اور تہذیب میں داخل ہے۔ اور اگر صبح اٹھ کر غسل کیا یا صابن سے منہ ہاتھ دھولیا ہے اور بنگلہ اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں گرد و غبار کا وہاں دخل نہیں، تو اس صورت میں نماز کے واسطے وضو کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ ایک صاحب ایسا ہی کرتے تھے کہ بے وضو نماز پڑھ لیتے تھے اور اگر کسی نے کہا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو کہتے یہ دقیانوسی مولویوں کے خیالات ہیں لوگ غور نہیں کرتے اور دین کی تہہ تک نہیں پہونچتے۔ عرب میں جب اسلام شروع ہوا تو افلاس بہت تھا۔ لوگ محنت مزدوری سے پیٹ بھرتے تھے۔ اور میلے کچیلے رہتے تھے اس واسطے اس وقت کے لئے بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ قید لگادی تھی کہ جب نماز پڑھو تو منہ ہاتھ دھولیا کرو۔ اب وہ زمانہ رہ نہیں گیا ہے اب مال کی افراط ہے۔ محنت مزدوری کی ضرورت نہیں۔ ہم آئینہ اور بنگلوں میں رہتے ہیں۔ روز صبح کو صابن مل کر غسل کرتے ہیں۔ گرد و غبار کا یہاں تک گذر نہیں۔ بتاؤ ہمارے بدن پر کیا لگ رہا ہے۔ جس کے واسطے بار بار دھوئیں (کوئی پوچھے کہ ہر روز صبح کو کیا لگ جاتا ہے جس کے واسطے روز روز نہلاتے ہو، مگر یہ کام تو اس استاد نے بتایا ہے جس کے حکم میں چون وچرا کی گنجائش نہیں یعنی فیشن نے) خود یہ بات بھی نہایت تعجب خیز ہے کہ عرب عموماً میلے کچیلے رہتے تھے یہ تاریخی بات ہے کہ ان کے یہاں تاریخ کو بڑا دخل ہے اور اسپر بڑی ایمان لاتے ہیں۔ تاریخ میں یہ مل گیا کہ عرب میں افلاس تھا۔ آگے عموماً اپنی رائے سے تجویز کر لیا کیا تاریخ میں کہیں یہ بھی ہے کہ اہل عرب سب ایسے ہی غریب اور مفلس تھے۔ کیا ان میں متنعم اور صاحب ثروت نہ تھے۔ عرب میں وہ لوگ بھی تھے جن کے یہاں سو سو غلام تھے تو اگر وضو کی بنا غربت اور مفلسی پر تھی تو ان لوگوں کو مستثنیٰ کر دیا جاتا اور صرف غریبوں کے لئے وضو کا حکم ہوتا۔

نیز صحابہ کے حالات ابتداء میں بے شک ایسے تھے مگر پھر حق تعالیٰ نے فتوحات دیئے اور والئ ملک ہوئے اور یہ حالت تھی کہ بدن پر بجائے عطر کے مشک ملا کرتے تھے۔ مگر کیا تاریخ میں کہیں ہے کہ انہوں نے وضو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بس زمانہ آزادی کا ہے جو چاہو کرو۔ جو چاہو کہو کوئی پوچھنے والا نہیں۔ چنانچہ وہ صاحب پانچوں وقت نماز بے وضو اڑاتے تھے ایک صاحب نے اور زیادہ ترقی کی کہ نماز بھی ندارد کر دی۔ کیونکہ مقصود بدون اسکے حاصل تھا۔ یعنی ریاضت جیسے

گھوڑے کی سواری وغیرہ ۔

ایک اور صاحب کا قصہ ہے کہ وہ ایک جگہ مدعو تھے اور بڑے معزز شخص تھے ۔ ان کے ساتھ اور بہت سے اشخاص بھی مدعو تھے گویا تمام جلسہ انھیں کی وجہ سے مدعو تھا اور سالار قافلہ بھی یہی تھے نماز کا وقت ہوا تو سب لوگ اٹھے مگر یہ نہ اٹھے ۔ کسی نے کہا آپ بھی نماز کو چلیں تو کہا میں نماز کو لغو سمجھتا ہوں ۔ لوگوں نے کہا نماز تو اسلام کی چیز ہے ۔ آپ ایسا کیوں کہتے ہیں تو آپ جواب میں (توبہ توبہ) کیا کہتے ہیں کہ میں اسلام ہی کو لغو سمجھتا ہوں ۔

صاحبو! یہ نوبت ہے ان لوگوں کی جو سربرآوردہ کہلاتے ہیں اور جن کی عزت کو لوگ اسلام کی عزت سمجھتے ہیں ۔ اس پر اگر کوئی مولوی کچھ کہے تو کہا جاتا ہے کہ مولویوں کو تو بس فتویٰ لگانا آتا ہے مسلمانوں کے کسی ایک فرد کو تو مشکل سے ترقی ہوتی ہے اسکے یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں بس ترقی تو می دیکھ ہی نہیں سکتے ۔

صاحبو! یہ کیا اسلامی ترقی ہے ۔ اب سنئے کہ اس شخص کے لئے اہل جلسہ میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز کیا کہ اس شخص نے ایسا بیہودہ کلمہ بکا ہے اس واسطے اسے بائیکاٹ کرنا چاہیئے اور اس سے قطع تعلق کر دینا چاہیئے ۔ تو دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ ہم کیوں اختلاف ڈالیں ۔ اس نے اللہ میاں کی شان میں گستاخی کی ہے ۔ اللہ میاں آپ نمٹ لیں گے ۔ سبحان اللہ! یہ صاحب صلح کل ہونگے مگر کیا یہ صلح کل ہے ۔ دار السلطنت کے باغی سے دوستی کر کے تو دیکھو ۔ دیکھیں صلح کل کے مذاق کو کیسا نباہتے ہیں مگر یہاں اہل جلسہ کو بھی تامل ہے کہ ایسے بیہودہ سے بائیکاٹ بھی کرنا چاہیئے یا نہیں افسوس! رڑکی میں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اسپر بحث کی تھی کہ نکاح کی پخر کیوں لگائی گئی ہے ۔ نکاح کی روح اور حقیقت تو تراضی ہے جہاں تراضی پائی جاوے ۔ نکاح ہی کا حکم ہونا چاہیئے عورت اور مرد کا ایک کے ساتھ مقید ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا ۔ ہاں جبر نہیں چاہیئے ۔ رضامندی سے کسی مرد اور عورت کے مل جانے میں کیا حرج ہے مگر یہ کیا ضروری ہے ۔ ایک بیوی ایک میاں ہو ۔ یہ مسلمانوں میں کمیٹی ہوئی تھی ۔

ایک لطیفہ

اس سے بڑھ کر ایک اور لطیفہ ہے (لطیفہ کیا ہے کثیفہ ہے) لکھنؤ میں ایک محلہ ہے خیالی گنج ۔ وہاں کے ایک صاحب مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے ۔ ایک روز ذرا دیر میں آئے تو پوچھنے پر بیان کیا کہ آج وہاں ایک کمیٹی ہوئی تھی جس میں اسپر بحث ہوئی کہ مسلمانوں کے تنزل کی اصل وجہ کیا ہے ۔ بہت گفتگو کے بعد

جو اخیر بات طے ہوئی وہ یہ کہ ان کا اصلی اور سبب تنزل کا اسلام ہے جب تک اس کو نہیں چھوڑا جاویگا ترقی نہیں ہوگی اور یہ بات پاس ہوگئی ۔ لعنت ہے اس پاس ہونے پر ۔

بے عزتی کی انتہا

اے صاحبو! خیال تو فرمایئے ۔ کہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے پھر اپنے کو کہتے ہیں ۔ ٹھیٹ مسلمان ہیں ۔ ٹھیٹ نہیں بلکہ تمہارے اسلام کی آنکھ ٹینٹ نکل آیا ہے جس نے بالکل بیکار کر دیا ۔ اور جس کا علاج سوائے نشتر کے کچھ بھی نہیں اور نشتر بھی کون سا؟ نائی کا پھر وہ نشتر نہیں جس سے آنکھ بن جائے بلکہ وہ جس سے اور پھوٹ جاوے اور کاٹ کر نکال دی جاوے کیونکہ اس میں قابلیت ہی بننے کی نہیں یہ تو نوبت ہے ۔ اگر اسپر کوئی حکم شرعی سنایا جاوے تو کہتے ہیں کہ بس مولویوں کو فتویٰ لگانا آتا ہے اور غصہ ان کی ناک پر رکھا رہتا ہے اور ذرا سی دیر میں برا مان جاتے ہیں ۔ اگر انکی ماں کو کوئی گالی دے تب دیکھیں یہ برا نہیں مانتے اور اس شخص سے دوستی قائم رہتی ہے یا نہیں اس وقت تو یہ بھی ایسا خشک برتاؤ کریں کہ مولوی بھی مخالف کے ساتھ نہ کریں ۔

بات یہ ہے کہ جس سے جس کا تعلق ہوتا ہے اس کو برا کہنے سے غصہ آتا ہے ۔ سو آپ کو اپنی ماں سے تعلق ہے اس واسطے ماں کو گالی دینے سے غصہ آگیا اور ایسا ہونا ہی چاہیئے ۔ اگر ایسا نہ ہو تو فطرت سلیمہ کے خلاف ہے ۔ اور ہم کو اللہ و رسول سے تعلق ہے اس لئے جب ہمارے اللہ تعالیٰ اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دی جاویں گی تو ہم کو کیسے غصہ نہ آوے گا اور کیوں ہم برا نہ مانیں گے اور کس طرح سے ایسے بیہودہ سے دوستی رکھیں گے ۔

ایک صاحب کا حال

ایک اور ایل، ایل، بی صاحب کا قصہ ہے (اتنا بڑا تو پاس کیا مگر بی ہی رہے) کہ انہوں نے مجمع میں کہا کہ رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے جو بضرورتِ مذہب مان لیا جاتا ہے ورنہ واقعہ میں اسکی کوئی اصل نہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کی توہین کرتا ہوں ۔ ایسا نہیں بلکہ میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں ۔ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) تو بڑے ریفارمر تھے ۔ اور آپ نے بڑی اصلاح کی ۔ لیکن رسالت صرف ایک مذہبی خیال ہے ۔ کیوں صاحبو! کیا ان پر بھی کوئی فتویٰ نہیں لگانا چاہیئے ۔ کیا یہ صریح کفر نہیں ہے ۔ افسوس یہ ہے کہ ان کے تحت ایک مسلمان دیندار لڑکی ہے اور جھگڑا جھٹ کئے ہو رہے ہیں اگر لڑکی کے گھر والوں سے کہیں کہ یہ نکاح باقی نہیں اور لڑکی کو اس سے الگ کر لینا چاہیئے تو ابھی ناصح پر تلوار کھینچ لی جاوے کہ ہم کو گالی

دیتے ہیں ۔

صاحبو! آجکل تو اس کی بھی ضرورت ہے اور میں بطور نصیحت اور خیرخواہی کہتا ہوں کہ جہاں دولہا کی صحت اور نسب اور حیثیت وغیرہ دیکھتے ہو ۔ اللہ کے واسطے اور رسولوں کے واسطے اس کا اسلام بھی دیکھ لیا کرو ۔ وہ زمانہ گیا کہ دولہا کے صرف افعال دیکھے جاتے تھے کہ نمازی اور پرہیزگاری بھی ہے یا نہیں ۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ اگر یہی دیکھ لیا کرو تو بہت ہے کہ وہ مسلمان بھی ہے یا نہیں اور لڑکی مسلمان کے گھر میں جا رہی ہے یا کافر کے گھر ۔ آجکل کے تعلیم یافتہ ایسے آزاد ہوئے ہیں کہ بہت سوں کا ایمان اور اسلام ہی باقی نہیں یقیناً کافر ہیں ۔ ان سے نکاح صحیح ہو ہی نہیں سکتا ان کو بیٹی دینے سے چکلہ میں بٹھا دینا بہتر ہے ۔ کیوں نام نکاح کا کیا ۔

بعض لیڈروں کی حالت

بعضوں کو تو اس قدر اجنبیت ہوئی ہے اسلام سے کہ نام بھی مسلمانوں کا سا پسند نہیں کرتے ۔ اور اس کو ذلت سمجھتے ہیں اور اہل یورپ کے سے نام رکھتے ہیں ۔ اور ایسوں کو لوگ قومی لیڈر کہتے ہیں اور ان کی تعریفیں کرتے ہیں کہ بڑے ہمدرد اور باحمیت ہیں ۔ مسلمانوں کے اوپر انہوں نے جان و مال فدا کر رکھا ہے ۔ آجکل کے لیڈروں میں حمیت تو ہے مگر صرف قومی حمیت ہے ۔ مذہبی نہیں یہ کوشش بیشک کرتے ہیں کہ ایک جماعت قائم رہے جن اہل اسلام کہا جاوے قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہوں بھی یا نہیں ۔ بلکہ یہ لوگ مذہبی حمیت کو جنوں کہتے ہیں ۔

لیڈران قوم کے قصے آپ نے سن لئے ۔ اگر ایسے لوگ بھی مسلمان ہیں تو دنیا میں کوئی بھی کافر نہیں ۔ ان سے وہ کافر بدرجہا اچھے ۔ جو کھلم کھلا اپنے آپ تو دوسری قوم میں شمار کرتے ہیں ۔ ان سے اتنا ضرر مسلمانوں کو نہیں پہونچتا ۔ کیونکہ مسلمان جانتے ہیں کہ یہ ہمارے مخالف ہیں اور ان لوگوں کو اپنا موافق سمجھتے ہیں اور حقیقت میں ان کو اسلام سے کوئی علاقہ نہیں تو یہ دشمن بصورت دوست ہیں ان سے مسلمان ہر وقت دھوکہ کھا سکتے ہیں ان سے وہ نقصان پہونچتا ہے ۔ جیسے ایک رئیس کو ریچھ سے پہونچا ۔ ایک رئیس نے ریچھ پالا تھا اور تعلیم اس کو یہ دی تھی کہ یہ سویا کرتے تھے اور وہ مکھیاں اڑا کرتا تھا ۔ ایک دفعہ آقا صاحب لیتے تھے اور بے خبر سو رہے تھے اور آقا صاحب محافظ تھے ہی ، اور اپنے معمول کے مطابق مکھیاں اڑا رہے تھے ۔ بعض مکھی ضدن ہوتی ہے کہ جہاں سے اڑایا جائے وہیں لوٹ لوٹ کر آتی ہے ۔ مکھی نے اسی ان محافظ صاحب کو دق کیا یہ اڑا اڑا دیتے ہیں اور وہ لوٹ لوٹ کر پھر منہ پر آبیٹھتی تھی ۔ بس ان کو غصہ آگیا

جیسے ایک افیونی کا قصہ ہے کہ ان کی ناک پر ایک مکھی بار بار آکر بیٹھتی تھی ۔ انہیں غصہ آگیا اور لے کر استرا اپنی ناک اڑا دیا کہ ے حرامزادی اب وہ اڈا ہی نہیں رہا ۔ اب بیٹھ ، کہاں بیٹھے گی حالانکہ جب تو ایک مکھی تھی اب تو اس کی ساری برادری خون پر آوے گی ۔

غرض اس ریچھ کو غصہ آگیا اور ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر لایا اور منتظر رہا کہ اب کے مکھی آوے تو اس کو اس پتھر سے ماروں گا چنانچہ وہ مکھی آقا صاحب کے منہ پر حسب دستور آکر بیٹھی ۔ انہوں نے پوری قوت سے اور نشانہ صحیح کر کے پتھر مارا ۔ مکھی تو اڑ کر الگ گئی اور آقا صاحب کا سر پاش پاش ہو گیا ۔

صاحبو! یہ ریچھ بھی خیرخواہ ہی تھا ۔ قرائن قویہ اس بات کی شہادت میں موجود ہیں کہ اس نے اس فعل میں کوئی بدنیتی نہیں کی ۔ اپنے نزدیک تو آقا کی خیرخواہی اور خدمت ہی کی ۔ مگر ایسی خدمت سے خدا بچاوے ۔ اس کا تو کام ہی تمام ہو گیا ۔

ایسی خیرخواہی آج کل اسلام کی ہو رہی ہے کہ ہمدردانِ اسلام اور خیرخواہان قوم وہ تجویزیں کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ترقی خواہ اسلام کا گلا ہی گھٹ جاوے ۔

نماز پر اعتراض

ایک اخبار میں چھپا تھا کہ اسلام ایسا مذہب ہے جس کی طرف بہت لوگوں کا رجحان ہے مگر اس میں نماز کی قید لگا رکھی ہے کہ اسکی وجہ سے بہت لوگ اس میں آنے سے رکتے ہیں ۔ اگر علماء نماز کو اس میں سے نکال دیں تو ہزاروں آدمی مشرف باسلام ہو جاویں ۔ اور مسلمانوں کی جماعت میں معقول اضافہ ہو جاوے اور بہت زیادہ ترقی اسلام کی ہو ۔ کیوں صاحب وہ اسلام ہوگا ، میں اس سے بھی سہل ترکیب بتاؤں ۔ وہ یہ ہے کہ سب قوموں کا نام مسلمان رکھ دیا جاوے ۔ خواہ وہ اس کو پسند کریں یا نہ کریں ۔ پس آج ہی کروڑوں کی تعداد کا اضافہ ہو جاوے گا ۔ دنیا میں کوئی قوم اور رہے گی ہی نہیں ۔ سب مسلمان ہی ہوں گے ۔

صاحبو! یہ لیڈران قوم اور عقلاء کی رائے ہیں ۔ نہ معلوم عقل اور ان لوگوں کی کون لے گیا ایک چیز کی ذاتیات اور ارکان موجود نہیں اور چیز موجود سمجھتے ہیں ۔ کسی چیز پر حیوان اور ناطق تو صادق آتے نہیں اور انسان کو اس پر صادق سمجھتے ہیں ، یا کسی کا . . . . . سر کاٹ کر الگ پھینک دیا گیا پاؤں الگ پھینک دیئے گئے اور تمام جسم کی بوٹی بوٹی الگ پھینک دی گئی ۔ مگر اس کل کو یہاں حی قائم سمجھ رہے ہیں نہ معلوم یہ کون سی معقول کا مسئلہ ہے کہ

وجود عدم کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ دین کی ہر ہر چیز کو تو حذف کر ڈالا اور دین موجود اور مسلمان ہونے کے مدعی ہیں ماموراتِ میں سے کوئی چیز مامور نہیں مانتے۔ نماز کی ضرورت نہیں۔ اس کی حقیقت جسمانی ریاضت ہے وہ اور طریقہ سے کر لی جاتی ہے۔ روزہ بہیمیت توڑنے کے لئے تھا وہ اس زمانے میں رہی نہیں۔ کیونکہ تعلیم کا زمانہ ہے۔ اسی طرح حج زکوٰۃ وغیرہ سب کتر بیونت کر کے ندارد کر دیا اور محرمات میں سے کسی چیز کو ممنوع نہیں سمجھتے۔ سود کی حرمت اڑا دی۔ اس کا تو آج کل اتنا زور و شور ہے اور اس مسئلہ میں ایسی تابلتیں دکھائی گئی ہیں کہ حلال ہی کر کے چھوڑا ہے۔

غرض اجزائے دین کو سب کو الگ کر دیا ہے اور منافیاتِ دین کو دین میں داخل کر لیا ہے اور خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں اور پکے مسلمان ہیں یہ تو ایسا ہوا جیسے کوئی اپنے کنبہ والوں اور دوستوں کو اپنے گھر سے نکال کر باہر کرے اور غیروں کو اور جانی دشمنوں کو گھر میں داخل کرے اور دیکھ کر خوش ہو رہا ہو اور خوشی خوشی لوگوں کو دکھا رہا ہو کہ دیکھو ہمارا گھر کیسا آباد ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ کیسا آباد ہے جبکہ وہ تیری تکابوٹی کریں گے۔

ایک بڑھیا اور شاہی باز

آجکل لیڈران قوم نے دین میں وہ تصرفات کئے ہیں اور ایسی خیرخواہی اس کے ساتھ کی ہے جیسے کسی بڑھیا نے ایک شاہی باز کے ساتھ کی تھی۔ حکایت اس کی اس طرح ہے کہ ایک شاہی باز اڑ کر ایک بڑھیا کے یہاں جا بیٹھا۔ بڑھیا نے اس کو پکڑ لیا اور اس کی چونچ اور پنجوں کو دیکھ کر بڑا رحم آیا۔ دیکھا چونچ ٹیڑھی ہے ناخن کس قدر بڑھے ہوئے ہیں اور ٹیڑھے بھی ہیں اور اس کو گود میں لیکر رونا شروع کیا کہ ہائے بچے تو کیسے زمین پر بیٹھتا ہوگا تیری انگلیاں ٹیڑھی ہیں ناخن اتنے بڑھ گئے ہیں اور کھاتا کیسے ہوگا کیونکہ چونچ بھی ٹیڑھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو بے ماں باپ کا ہے کوئی تیری غور کرنے والا نہیں ہے جو ناخن کاٹتا اور چونچ کو درست کرتا۔ اور رحم و شفقت نے ایسا زور کیا کہ قینچی لے کر سب ناخن کاٹ دیئے اور چونچ بھی تراش دی۔

اپنے نزدیک تو بڑھیا نے بڑی خیرخواہی اور ھمدردی کی۔ مگر خدا بچا وے ایسی ھمدردی سے کہ اس کو برباد ہی کر دیا۔ نہ وہ شکار پکڑنے کے کام کا رہا اور نہ کھانے کے۔

یہی خیرخواہی اسلام کے ساتھ آجکل کے ہمدردانِ اسلام کرتے ہیں کہ یہ بھی فضول اور وہ بھی فضول۔ نماز بھی زائد اور روزہ بھی زائد۔ زکوٰۃ کی حاجت نہیں، حج بھی فضول ہے۔ اور پھر مسلمان ہونے کے مدعی۔ معلوم نہیں اسلام کس چیز کا کام ہے۔ کوٹ کا نام ہے یا پتلون

کا نام ہے۔ جب اسلام کا ہر جزو فضول ہے تو کل بھی فضول ہے اس کا نام ہی کیوں لگا رکھا ہے۔ ہم تو جانیں تم بھی فضول ہو جو ایسی فضول باتیں کرتے ہو۔ سچ یہی ہے کہ درحقیقت یہی لوگ فضول ہیں ایک پیسہ کا سنکھیا کھا کر مر جاتے تو دنیا ایسے ناپاک وجود سے پاک ہو جاتی۔

غرض اس گروہ نے (یعنی امراء نے) عجیب گت بنائی ہے دین کی۔ درحقیقت یہ تو دین سے بالکل الگ ہیں مگر نام نہاد کے لئے دین کا ایک خلاصہ نکال لیا ہے اور اس کو دین کا لب لباب سمجھ کر خوش ہیں کہ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ لہٰذا ہم دین دار ہیں۔ وہ خلاصہ تہذیب اخلاق ہے۔ اس کو دین کا باطن کہتے ہیں اور خیال ہے کہ باطن ہی مقصود اعظم ہے۔ ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ انہوں نے اس طرح دین کا باطن نکالا۔ اور درویشوں نے اور طرح نکالا تھا جس کو میں بیان کر چکا ہوں۔

غرض ان دونوں جماعتوں نے ظاہر کی ضرورت نہیں رکھی پس یہ حدیث اس پر رد کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ظاہر بھی مقصود اعظم ہے۔ کیونکہ حضور قلب کو شرط کیا دعا کے لئے چنانچہ فرماتے ہیں۔ ان اللّٰہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ یعنی اللہ تعالیٰ بلا حضور قلب کے دعا قبول نہیں کرتا۔ یہاں دعا عمل ہے اور اس کے لئے شرط ٹھہرایا ہے حضور قلب کو اور ظاہر ہے (جیسا کہ میں اوپر بھی کہہ چکا ہوں کہ شرط میں حیث الشرط تابع ہوتی ہے) پس معلوم ہوا کہ اصل شرط دعا ہے اور حضور قلب اس کے تابع ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصل مقصود عمل ظاہر ہے اور باطن اس کے لئے شرط اور اس کا تابع ہے۔ اس سے ان دونوں جماعتوں کے اس خیال پر رد ہو گیا کہ اصل مقصود باطن ہے۔ یہ تحقیق تو نسبت بین الظاہر والباطن کی حیثیت سے ہوئی اب عقلی طور پر سمجھئے کہ اس میں فلسفیانہ راز ہے وہ یہ کہ ہر چیز کی ترقی عمل سے ہوتی ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اس کو آجکل کے لوگ تہ دل سے مانتے ہیں۔ کیونکہ ترقی کا مدار اسی پر ہے اور ترقی ہی ترقی کا آجکل ہر چہار طرف غل ہے۔ سو سب کو معلوم ہے کہ خیال باطن ہے اور عمل ظاہر، اور ترقی صرف خیال سے نہیں ہوتی۔ چنانچہ لیکچروں میں برابر کہا جاتا ہے کہ ترقی کے لئے ہاتھ پیر ہلاؤ۔ صرف خیال سے کچھ نہ ہوگا۔ عمل کر کے دکھاؤ عملی حالت کو بدلو۔ تب کو پستی سے نکل کر عمل کے میدان میں آؤ گے۔ اس کی بنا اسی بات پر تو ہوئی کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے صرف خیال اس کے لئے کافی نہیں گو یہ ضرور ہے کہ عمل اس خیال ہی سے پیدا ہوتا ہے اور خیال کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے کیونکہ اعضا تابع

ہوتے ہیں قلب کے ، اور قلب میں ایک بات مرتبۂ خیال میں پیدا ہوتی ہے تو اس کے بعد اس کا ظہور مرتبۂ فعل میں اعضاء سے ہوتا ہے ۔ کہاں ہیں مدعیان سائنس اور مدعیان تعلیم ۔ ذرا اپنے سائنس ہی کے مسئلہ میں غور کریں کہ ہر فعل کے وجود کے لئے دونوں باتوں کی ضرورت ثابت ہوئی ۔ خیال کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں باطن کہہ سکتے ہیں ۔ اور عمل کی بھی جس کو دوسرے لفظ میں ظاہر کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ ان دونوں میں سے کارآمد دراصل چیز جس سے ثمرہ مرتب ہوتا ہے وہ عمل ہے یعنی ظاہر نہ کہ خیال یعنی باطن ۔ گو بلا باطن کے وجود ظاہر نہیں ہو سکتا ہو ۔ اس کی مثال پھل اور گٹھلی کی ہے ۔ مثلاً آم ہے ۔ آم کا پھل ہے نہ کہ گٹھلی ۔ گو وجود پھل کا موقوف ہے گٹھلی پر ۔ تو جس کو آم کھانا ہو اس کی گٹھلی سے بھی گریز نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اول کام گٹھلی ہی سے پڑے گا مگر مقصود بالذات اور کام کی چیز پھل ہی ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں ۔

ظاہر و باطن

تو ان لوگوں کی مثال جو محض باطن کو مقصود اعظم قرار دیتے ہیں اور ظاہر کو نہیں سمجھتے ایسی ہوگی کہ ایک شخص نے گٹھلیاں ٹوکرہ بھر کر جمع کر لی ہوں اور خوش ہو کر ہمارے پاس آم ہیں اور ہم آم کھاتے ہیں اور جب کوئی اس پر اعتراض کرتا ہو تو جواب دیتا ہو کہ میاں اصلی چیز تو یہی ہے اس کے بغیر تو پھل کا وجود ہی نہیں ہو سکتا ۔

صاحبو ! یہ دلیل تو ٹھیک ہے مگر کیا کوئی اس کو اس دلیل کی رو سے آم کھانے والا کہہ سکتا ہے ۔ حاشا وکلا ۔ آم کی ان کو خوشبو بھی نہیں آئی ۔ اور بوجھوں مرے مفت ۔ تو اصل یہی ٹھہری کہ بڑا مقصود ظاہر ہی ہوا کہ وہ وجود میں موقوف ہو باطن پر ۔ اور یہ بعینہٖ سائنس کا وہی مسئلہ ہے کہ ترقی کا مدار عمل پر ہے ۔ نرا خیال کافی نہیں گو عمل کا وجود خیال ہی سے ہوتا ہے ۔ ورنہ نرا خیال تو شیخ چلی نے بھی پکایا تھا ۔ اگر خیال سے ترقی ہو سکتی ہے تو شیخ چلی کو بڑی ترقی ہوتی ۔ اور اگر یہی ترقی ہے تو ایسی ترقی تو بہت سہل ہے ۔ ہر شخص بے محنت و مشقت گھر میں بیٹھے حسب دلخواہ کر سکتا ہے ۔ (الظاہر ص۳۵ تا ۴۴)

عمل کی ضرورت

صاحبو ! خوب سمجھ لیجئے کہ کوئی مقصود بلا مشقت اور بلا ہاتھ پیر ہلائے حاصل نہیں ہو سکتا ۔ نہ دنیا کا نہ آخرت ۔ اس مشقت ہی کا نام عمل ہے اور اسی کا ظاہر اور باطن نام صرف خیال کا ہے ۔ اگر ظاہر کو اڑا دیا تو رہا کیا ۔ صرف خیال جو کچھ بھی کارآمد نہیں ۔ جیسا کہ آپ کا سائنس بھی اس کو ثابت کرتا ہے اور آپ خود بھی مانتے ہیں کہ ترقی عمل سے ہوتی ہے نہ صرف ارادوں اور ڈھکوسلوں سے ۔ پھر یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ نرا

باطن کافی ہے اور ظاہر کی ضرورت نہیں ۔

یہ عقلی ثبوت بھی ہو گیا ظاہر کی ضرورت کا اور اس کے مقصود ہونے کا حدیث سے پہلے ثابت ہو چکا ۔ اور اس حدیث کے علاوہ دوسرے نصوص بکثرت موجود ہیں جو اس باب میں بالکل صریح ہیں اور وہ نصوص اس قدر ہیں کہ دنیا بھر ان کو جانتی ہے اور ہمارے مخاطبین کو بھی معلوم ہیں کہ مگر انہوں نے ان میں ایک اور ترکیب چلی ہے وہ یہ کہ ان کے معنیٰ بدلے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے معنیٰ وہ نہیں جو مولوی لوگوں نے سمجھ رکھے ہیں اور اپنے مذاق کے موافق کھینچ کھانچ کر معنیٰ بیان کرتے ہیں ۔ اس وقت ان کی تفصیل کا موقع نہیں ۔ اجمالاً یہ کہنا کافی ہے کہ آیا وہ معنیٰ صحیح ہوں گے جو لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں اور اہل علم نے سمجھے ہیں یا وہ جو کسی ایک دو نے اختراع کر لئے ۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ جب سے شریعت مقدسہ آئی اس وقت سے ان نصوص کے معنیٰ کیا سمجھے گئے ۔ اور تمام امت نے ظاہر کو ضروری سمجھا یا نہیں ۔ تمام کتابیں بھری پڑی ہیں اعمال کی ضرورت سے اور ایک ایک عمل کی کیفیت اور اس کے اجزاء ضروری اور غیر ضروری ۔ اور متممات و محسنات اور اس کے مفسدات و مکروہات سب تفصیل کے ساتھ مدون ہیں پھر اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی اگر عمل کی ضرورت نہیں تھی ۔ کیا اس سب امت کی امت نے غلط معنیٰ سمجھے ۔ ظاہر ہے کہ ایک کے سمجھے ہوئے معنیٰ غلط ہو سکتے ہیں ۔ نہ کروڑوں کے سمجھے ہوئے خوب سمجھ لیجئے کہ یہ الحاد ہے اور دہریت ہے اور زندقہ ہے اور شریعت کا انکار ہے جو اس کا مرتکب ہے وہ بیشک باطل پر ہے خواہ اپنے زعم میں تعلیم یافتہ ہو ۔ اور دیندار ہو اور مقتدا ہو اور عقلمند ہو ۔ اور کچھ بھی ہو ۔ اور یہ اعمال ترک تعطل ہے اور یہ نفس کا دھوکہ ہے اور انجام اس کا حسرت ہوگا ۔ جس کے اعمال صحیح نہیں وہ کسی شمار میں بھی نہیں اور یقین کے ساتھ سمجھ لیجئے کہ نہ کفر کے ساتھ خدا تک رسائی ہو سکتی ہے نہ فسق کے ساتھ ۔ خدا تک رسائی طاعت کے ساتھ ہوتی ہے اور طاعت نام ہے عمل کا جس میں باطن کے ظاہر بھی آ گیا جس میں عمل نہیں وہ خدا رسیدہ کبھی نہیں ہو سکتا ۔ (ایضاً ص۴۵، ۴۶)

۴۶ - طبیعت بے شعور کو فاعل ماننا سراسر حماقت ہے

عقلاء میں اب تک اختلاف ہے کہ عقل جوہر مجرد ہے یا جوہر مادی ہے ۔ اور یہ نفس ناطقہ کے علاوہ کوئی چیز ہے یا خود نفس ہی کا نام عقل ہے ، یہ عقل کا علم ہے پھر اس کو احکام خداوندی میں

مزاحمت کا کیا حق ہے، جو لوگ عقل کے بہت متبع ہیں وہ ہر وقت بڑے پریشان ہیں۔ ہر چیز کی لِم دریافت کرنا چاہتے ہیں مگر بعض جگہ گاڑی اٹک جاتی ہے اور کوئی بات نہیں بنتی۔ اور جہاں کچھ اسباب وعلل معلوم بھی ہوجاتے ہیں وہ بھی تخمیناً اور اٹکل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرسوں آندھی آئی تھی میں کہہ رہا تھا کہ عقلاء کے نزدیک اس کے بھی کچھ اسباب ہیں تو یہ لوگ ان اسباب میں تصرف کرکے ذرا اس کو روک تو دیں۔ آخر وہ بہت سے اسباب میں یہ تصرف کے مدعی ہیں۔ آندھی کے اسباب میں بھی ذرا تصرف کرکے دکھائیں دو حال سے خالی نہیں، یا تو اسباب اختیاری ہیں یا غیر اختیاری اگر اختیاری ہیں اور یہ قابل تصرف نہیں تو معلوم ہوا کہ آندھی کا آنا اور اس کا روکنا کسی اختیار میں نہیں تو پھر خواہ مخواہ اسباب کا نام کیوں کرتے ہیں۔ موحد کی طرح صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حق تعالیٰ کے حکم سے آندھی آتی ہے۔ اسی طرح زلزلہ آتا ہے اس کے لئے بھی ان کے نزدیک کچھ اسباب ہیں تو ذرا ان اسباب میں تصرف کرکے زلزلہ کو روک تو دیں۔ زلزلہ کو تو کیا روکتے۔ جن چیزوں کا ان کو تجربے سے علم بھی ہوچکا ہے ان کی بھی لِم معلوم نہیں۔ مثلاً زلزلہ سے کچھ پہلے مقناطیسیت کی خاص جذب زائل ہوجاتی ہے ذرا اس کی لِم مجھے کوئی بتلادے کہ آخر زلزلہ میں اور مقناطیس کی قوت میں تعلق کیا ہے۔ زلزلہ سے اس کی قوت جذب کیوں زائل ہوجاتی ہے۔ کوئی شخص اس کی لِم بیان نہیں کرسکتا باقی اٹکل پچو بات گھڑ دینا تو ہر ایک کو آسان ہے۔ لِم تو وہ ہے جس کو دل بھی قبول کرلے ورنہ گھڑ گھڑ کر بیان کردینا کیا مشکل ہے۔ مگر وہ ایسی ہی لِم ہوگی جیسے بعض لوگوں نے چیتے کے بدن پر نشانات کی وجہ بتلائی ہے کہ وہ دھوپ میں سیاہی دار درخت کے نیچے بیٹھتا تھا اس لئے جہاں دھوپ پڑی وہاں سے سفید ہوگیا اور جہاں سایہ پڑا وہاں سے سیاہ ہوگیا۔ بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اس چیتے کے پاس کوئی پرکار تھی کہ ہر روز ایک ہی جگہ میں ٹھیک بیٹھتا تھا اور آہستہ آہستہ دھوپ سے سایہ میں اور سایہ سے دھوپ میں اس طرح ہٹتا تھا کہ بدن پر گول گول ہی نشانات پڑیں کوئی نشان مربع یا مستطیل یا مثلث یا مکعب نہ ہو۔ کیا کسی کے دل کو یہ بات لگ سکتی ہے چیتا کیا ہوا، بڑا ماہر انجینیر ہوا۔ مگر احمقانہ وجوہ پر یہ لوگ خوش ہیں کہ ہم نے تو وجہ بیان کردی ہے چاہے وہ ایسی ہی وجہ ہو جیسے ایک شخص نے جاٹ سے کہا تھا کہ جاٹ رے جاٹ تیرے سر پہ کھاٹ۔ اس نے کہا شیخ رے شیخ تیرے سر پہ کولہو۔ شیخ نے کہا واہ قافیہ تو ملا ہی نہیں۔ کہنے لگا قافیہ نہ سہی بوجھ میں تو مرے گا ہی۔ ان کی وجہ ہوتی ہے کہ چاہے جوڑ نہ ہو مگر وجہ ہونی چاہیئے۔ یہ ساری خرابی ہے۔ طبیعت بے شعور کو فاعل ماننے کی وجہ کیونکہ یہ لوگ تو یہ کہہ نہیں سکتے

کہ یہ نشانات طبیعت نے بلا واسطہ بنادیئے ہیں کیونکہ طبیعت میں ارادہ اور شعور ہی نہیں وہ کس طرح افعال مختلفہ بناتی۔ اس لئے اسباب کا واسطہ مانتے ہیں پھر اٹکل پچو اسباب گھڑ کر نکالتے ہیں۔ اور موحد کو کسی جگہ اٹکاؤ نہیں وہ بڑا بے فکر ہے۔ جس بات کی اس سے وجہ پوچھو وہ کہتا ہے خدا نے یونہی بنانا چاہا تھا بنادیا اور گو وہ واحد حقیقی ہے مگر ارادہ کے تعلق کی وجہ سے افعال میں اختلاف واقع ہوگیا۔ اس لئے الواحد لا یصدر عنہ الواحد کے بھی خلاف نہیں، کیونکہ یہ حکم علت موجبہ میں ہے حق تعالیٰ ایجاب سے منزہ ہیں اور طبیعت میں ارادہ ہی نہیں وہ علت موجبہ ہی ہوگی اس لئے اس کی طرف ان افعال کی نسبت نہیں کرسکتے ہائے کیسے ذی شعور کو فاعل مانا اور جس جگہ ان سے کوئی تاویل نہیں بنتی۔ نہ الٹی نہ سیدھی۔ نہ کوئی سبب ظاہری سمجھ میں آتا ہے تو وہاں بھی ظالم خدا کو فاعل نہیں مانتے بلکہ ان مواقع کے لئے بخت اتفاق کو گھڑ لیا ہے۔ مگر یہ محض نام ہی نام ہے۔ ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم واباءکم۔

صرف عقل پر اعتماد کا انجام

کوئی ان سے پوچھے بخت واتفاق ہے کیا بلا۔ اس میں فاعلیت کی قوت کہاں سے آگئی اور یہ کیوں کر سبب بن گیا۔ بس اس کا کچھ جواب نہیں۔

یہ ہے عقل محض کے اتباع کا نتیجہ جس سے ایسی بے عقلی کی باتیں ماننا پڑتی ہیں۔ موحد کیسے چین میں ہے کہ اس کو ایسی دور از کار باتیں سوچنے کی ضرورت نہیں وہ کہتا ہے کہ سب کا فاعل خدا ہے اس نے جس طرح پیدا کرنا چاہا کردیا۔ اور اس کو طبیعت کی ضرورت ہے نہ بخت واتفاق کی اور جہاں ظاہر میں کچھ اسباب کا دخل معلوم بھی ہوتا ہے وہاں وہ کہتا ہے کہ اسباب مؤثر بالذات نہیں ہیں بلکہ یا تو مؤثر باذن الخالق ہیں جیسا کہ ایک قول ہے اور یا مؤثر ہی نہیں بلکہ محض علامات ہیں جیسا کہ ایک قول ہے جیسے جھنڈی کا ہلنا ریل کے چلنے کی محض علامت ہے مؤثر بالذات حق تعالیٰ ہیں اگر وہ ارادہ کریں تو سارے اسباب بیکار پڑے رہیں جیسے ڈرائیور گاڑی کو روکنا نہ چاہے تو ہزاروں سرخ جھنڈیاں بیکار ہوتی ہیں۔ بتلایئے یہ شخص چین میں ہے یا وہ شخص جو کبھی اسباب کو فاعل مانتا ہے کبھی طبیعت کو کبھی بخت واتفاق کو، موحد ان اسباب پرستوں کی پریشانی دیکھ کر یوں کہتا ہے ؎

اربًا واحدا ام الف رب	ادین اذا قسمت الامور
ترکت اللات والعزیٰ جمیعًا	کذالک یفعل الرجل البصیر

وہ ان سب لات اور عزیٰ پر لات مارتا ہے اور ایک خدا کو فاعل مانتا اور اسباب پرستوں سے کہتا ہے کہ تم ایک خدا کو چھوڑ کر کہاں مارے مارے پھرتے ہو چھوڑو ان خرافات کو اور یہ مذہب

اختیار کرو ؎

؎ مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار ۔
بگذارند وخم طرۂ یاری گیرند ۔

اور مولانا جامیؒ فرماتے ہیں ؎

خلیل آسا درملک یقین زن — نوائے لااحب الآفلین زن ۔

کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ اسباب اس کے قبضہ میں ہیں ؎

خاک وآب وآتش بندہ اند — بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

واقعی موحد سے بڑھ کر کوئی چین میں نہیں ۔ پھر مشرکین کے بعضے معبود ایسے کہ ان میں باہم رقابت ہے ۔ وہ ایک کی عبادت دوسرے سے چھپا کر کرتے ہیں۔ کہیں وہ یہ معلوم کرکے کہ دوسرے کے پاس بھی جاتا ہے کہ ناخوش نہ ہوجاوے ۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام صہ ۱۹ تا ۲۲)

خدا کے منکر

آجکل کے حکماء تو ایسے بد تہذیب ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں ۔ ان کی ایسی مثال ہے جیسے ایک چپراسی اپنے افسر سے تنخواہ لیتا ہو مگر تنخواہ لینے کے بعد کہتا ہے کہ میرا کوئی افسر نہیں ۔ نہ مجھے کوئی تنخواہ دیتا ہے بلکہ زمین سے خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں اور ہوا سے اڑ کر میرے ہاتھ میں آجاتے ہیں ۔

رسالہ حمیدیہ میں موحد اور دہری کی مثال ایک گفتگو کے پیرائے میں خوب لکھی ہے کہ ایک موحد اور ایک دہری کسی جزیرے میں گئے ۔ وہاں ایک مکان نہایت خوبصورت مستحکم بنا ہوا دیکھا جس ایک طرف کھانے کا کمرہ ہے جو فرش فروش اور آئینوں سے سجا ہوا ہے ۔ ایک طرف سونے کا کمرہ ہے جسمیں عمدہ عمدہ مسہریاں بچھی ہوئی اور سقفی پنکھے لگے ہوئے ہیں ہر کمرہ میں ہوا کے لئے روشندان بنے ہوئے ہیں ۔ ایک طرف باغ لگا ہوا ہے جس کے درخت نہایت قرینہ سے لگائے گئے ہیں ۔ ایک طرف حوض بنا ہوا ہے جس میں فوارہ سے ہر وقت پانی آتا ہے مؤحد نے اس مکان کو دیکھ کر کہا کہ اس کا بنانے والا بڑا ہی صناع اور بہت ہی ماہر تھا جس نے نہایت عمدگی اور مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ اس مکان کو تیار کیا ۔ دہری نے کہا کہ اس کے بنانے والا کوئی نہیں ۔ بلکہ عرصہ دراز سے بارش ہونے کی وجہ سے زمین کی مٹی جم گئی ۔ پھر دھوپ سے پختہ اینٹیں بن گئیں ۔ پھر ہوا سے اڑ اڑ کر وہ اینٹیں اس جگہ آکر جمع ہوگئیں ۔ پھر ہوا چلی اور ان کو اوپر نیچے کر دیا اس طرح دیواریں بن گئیں ۔ پھر پہاڑوں سے پتھر گرے اور ہوا نے ان کو اڑا کر یہاں کھڑا کر دیا ۔ اس سے

ستون بن گئے ۔ پھر درختوں کی لکڑیاں ہوا سے ٹوٹ گئیں ۔ وہ اڑ کر یہاں چھت کی صورت میں قائم ہوگئیں ۔ اس طرح اس نے ساری مکان کو ہوا اور دھوپ سے تیار کر دیا ۔ میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ بتلائیے ان میں گدھا کون ہے آدمی آدمی کون ہے ۔ یقیناً وہ شخص بالکل گدھا ہے جو ایسے مکان کی نسبت یوں کہتا ہے کہ خود بخود تیار ہوگیا ۔

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ جو لوگ آسمان وزمین کی اتنی بڑی عجیب وغریب عمارتوں کو کسی صانع کی بنائی ہوئی نہیں مانتے ۔ بلکہ از خود تیار مانتے ہیں وہ بیوقوف ہیں یا نہیں ۔ تو یونان کی حکمت اس حکمت سے پھر بھی اچھی تھی ۔ وہ لوگ خدا کے تو قائل تھے اور اہل سائنس تو غضب کرتے ہیں کہ خدا کے بھی منکر ہیں اور سائنس والوں میں سے جو مسلمان خدا کے قائل بھی ہیں یہ ان کی محض وضع داری ہے ورنہ ان کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی سے پوچھے کہ تو نے بادشاہ کو دیکھا ہے وہ کہے کہ ہاں دیکھا ہے اس کے ایک سونڈ تھی اور ذرا سا سر تھا اور آنکھیں نہیں تھیں ۔ تو پہلا شخص یہ اوصاف سنکر کہے گا کہ کمبخت تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا ۔ نہ معلوم کس بلا کو دیکھ لیا ہے بادشاہ تو ایسا بدصورت نہیں ہے ۔

سائنسدانوں کا حال

یہی حال ان سائنسدانوں مسلمانوں کا ہے جو خدا کے قائل ہیں مگر اس کے کمالات کے منکر ہیں ۔ جن میں سے ایک بڑا کمال یہ ہے **یفعل ما یشاء ویحکم ما یرید** مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس خدا نے عالم کو پیدا کر کے طبیعت اگر مادہ کے سپرد سارا کام کر دیا ہے اب جو ہوتا ہے وہ اسباب طبیعیہ سے ہوتا ہے خدا تعالیٰ کے ارادہ کو کچھ دخل نہیں گویا خدا نے گھڑی میں کوک بھر دی ہے ۔ اب اس کے چلنے میں فراخاں اور بال کمانی کی طاقت کو دخل ہے ۔ خدا کو کچھ دخل نہیں ۔ اسی لئے یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی نار کے گلزار ہونے کا انکار کرتے ہیں کہ آگ بھلا کیونکر ٹھنڈی ہوگئی ۔ یہ تو قانون طبیعت کے خلاف ہے بھلا بنی اسرائیل پر پہاڑ کیونکر معلق ہوگیا اور ایک ذرا سے پتھر میں سے بارہ چشمے کیونکر بہنے لگے ۔ یہ قانون فطرت کے خلاف ہے ۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کو قانون فطرت کے تابع بنا دیا ۔

موحد کہتا ہے کہ نہ معلوم تم کس عاجز کو خدا سمجھتے ہو ۔ خدا تو ایسا عاجز نہیں ۔ اس کی تو شان یہ ہے کہ ایک پتہ بھی اس کے حکم وارادہ کے خلاف نہیں ہل سکتا ۔ اور اگر وہ چاہے تو تمام عناصر کی خاصیت کو دم بھر میں بدل دے ۔

پھر ان اوصاف کے ساتھ ان کا یہ کہنا کہ ہم خدا کے قائل ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ اس شخص نے

کہا تھا کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا ہے اس کے ایک سونڈ تھی اور آنکھیں ندارد تھیں ۔ مگر بایں ہمہ ان کو کافر نہ کہیں گے کیونکہ ان کے اقوال سے صرف خدا کا انکار لازم آیا ہے ۔ التزام نہیں پایا گیا ہے اور لزوم کفر کفر نہیں التزامِ کفر کفر ہے اس لئے ہم ایسے مسلمان کو کافر نہیں کہتے ۔

ایک اور مزے کی بات سنئے ۔ جب اہل سائنس نے خدا کا انکار کیا اور طبیعت کو فاعل مانا تو ان کو اس کی بھی فکر ہوئی کہ اسباب طبعیہ کے موافق انسان کی اصل دریافت کی جائے ۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کا خدا کے ہاتھ سے پیدا ہونا تو ان کو مسلم نہیں یہ تو انسان کی عقل سے بعید ہے تو ڈراون کو یہ کہنا پڑا کہ انسان کی اصل بندر ہے ۔ بندر ترقی کر کے انسان بن گیا ۔ اس کا نام مسئلہ ارتقاء ہے اس بیچارے کو اپنے مناسب تمام حیوانات میں بندر ہی نظر آیا ۔ جب کوئی اس قول کی تردید کے درپے ہوتا ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ اس قول کے انکار کی ضرورت نہیں ۔ اس کو اپنے نسب کا حال ہم سے زیادہ معلوم ہے اس لئے وہ اپنا نسب بیان کرتا ہے وہ بندر ہی کی نسل سے ہوگا ۔ اور ہم کو اپنے نسب کا حال اس سے زیادہ معلوم ہوگا کہ آدم علیہ السّلام کی نسل سے ہیں ۔ تو تم اس بات کا انکار کیوں کرتے ہو ۔ وہ بیچارہ تو اپنا نسب بتلا رہا ہے ۔ تمہارا نسب تھوڑا ہی بتلا رہا ہے اور جس دن وہ ہمارا بتلادے گا ہم کہدیں گے کہ " صاحب البیت ادریٰ بما فیہ " ، گھر والوں کو اپنے گھر کی خبر دوسروں سے زیادہ ہوتی ہے ۔ اس لئے ہمارے نسب کی خبر تجھ کو ہم سے زیادہ نہیں ہوسکتی ۔ ہمارے پاس شجرۂ نسب آدم علیہ السلام تک محفوظ ہے ۔ تجھے ہمارے نسب میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ۔ ہاں تیرے پاس اپنا شجرۂ نسب محفوظ نہ ہوگا تو تجھے اختیار ہے جس سے چاہے اپنا نسب ملالے (مجہول النسب یہ نہ کرے تو اور کیا کرے) (جامع)

یہ ساری خرابی طبیعت کو فاعل ماننے سے لازم آئی ۔ خدا کو مان لیتے تو اس جھگڑے میں نہ پھنستے ۔ یہ تو ان سائنس والوں کا حال تھا جو خدا کے منکر ہیں ۔ اب ان سائنس والوں کا حال سنئے جو برائے نام خدا کے قائل ہیں ۔

ایک صاحب علم کا قصہ

ان میں سے ایک صاحب علم کا قصہ ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں آدم علیہ السلام کا قصہ ڈراون کی تحقیق سے مصادم ہے تو وہ بولے شاید وہ پہلا بندر جس نے انسان کی طرف سب سے پہلے ترقی کی ہے ۔ (نعوذ باللہ) آدم علیہ السلام ہی ہو ۔ استغفر اللہ ۔ استغفر اللہ ۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اس بات کی نقل سے بھی ۔ اسی لئے میں نے کہا تھا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور خدا کا قائل بتلاتے

ہیں ۔ یہ محض وضع داری ہے ورنہ حقیقت میں یہ خدا کے قائل نہیں ۔ بھلا ڈاردن کو تو اس قول پر اس بات نے مجبور کیا تھا کہ وہ خدا کو فاعل نہیں مانتا ۔ طبیعت کو فاعل مانتا ہے ۔ اور طبیعت دفعۃً ترقی نہیں کرسکتی ۔ تدریجًا ترقی کرتی ہے کہ پہلے اجسام بسیطہ یعنی عناصر کی صورت اختیار کی ۔ پھر اس سے ترقی کر کے جمادات مرکبہ کی صورت اختیار کی پھر اس سے ترقی کر کے حیوانات کی صورت اختیار کی ۔ پھر حیوانات میں سے کسی نے ترقی کر کے انسان کی صورت اختیار کرلی ۔ مگر جو شخص خدا کو فاعل مختار مانتا ہو ۔ اس کو اس قول کی طرف کس چیز نے مضطر کیا ۔ اس کے نزدیک اس میں کیا استحالہ ہے کہ خدا تعالیٰ آدم علیہ السلام کے پتلے کو مٹی اور پانی سے بنا کر دفعۃً اس کو انسان بنا دیں ۔ اس ظالم کو ڈاروِن کی تقلید پر کس بات نے مجبور کیا کہ وہ خواہ مخواہ ایک نبی کی توہین پر آمادہ ہوتا ہے ۔

پھر اس میں علاوہ توہین نبی کے یہ بھی خرابی ہے کہ یہ تاویل ڈراون کے قول پر بھی غلط ہے کیونکہ ڈراون اس کا قائل نہیں ہے کہ دنیا میں بس ایک بندر ترقی کر کے انسان ہوا ہو جس کی نسل میں یہ سب انسان ہیں ۔ وہ کہتا ہے کہ جس وقت بندر کی طبیعت نے ترقی کی ہے تو ایک خاص وقت میں ہر جگہ ہزاروں لاکھوں بندر آدمی بن گئے ۔ اور یہ سب ایک کی نسل سے نہیں تو اس شخص نے ڈراون کی تقلید میں قرآن کے اندر تقلید کی اور وہ تحریف بھی ڈراون کے یہاں قبول نہیں تو ادھر سے بھی گئے ۔ ادھر سے بھی گئے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے رہے

ہائے یہ لوگ ایک خدا کو چھوڑ کر کدھر مارے مارے پھرتے ہیں موحد کو ایک خدا سے تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا واسطہ علاقہ ہے اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں غلطی نہیں ہوسکتی ۔ آپ کی شان یہ ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود ۔

موحد کا حال

اس موحد کو اپنے علوم پر اطمینان ہوتا ہے ۔ اور کیوں نہ ہو وہ علوم ہی اطمینان بخش ہیں ۔ موحد کہتا ہے کہ ہر چیز کا فاعل خدا ہے ۔ خدا نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر کے انسان بنا دیا ۔ اس کو کچھ ضرورت نہیں کہ اپنا نسب بندر یا سور سے ملائے ۔

تو خدا کو فاعل بنانے میں کیسی راحت ہے کہ سب جھگڑوں سے نجات ہوگئی ۔

یہ تو علمی راحت ہے اور دنیوی حسی راحت یہ ہے کہ حوادث و مصائب میں موحد مستقل

وطمئن ہوتا ہے وہ کہتا ہے۔ قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ھُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ کہ غم وہی پیش آوے گا جو خدا نے مقدر کر دیا ہے اس کے خلاف ہرگز پیش نہیں آسکتا اور حق تعالیٰ ہمارے آقا اور مولیٰ ہیں ان کی طرف سے جو کچھ پیش آویگا اس میں رحمت وحکمت ہی ہوگی اسلئے خدا تعالیٰ ہی پر بھروسہ مسلمان کو کرنا چاہیئے۔

بتلائیے جس کا یہ اعتقاد ہو وہ مصائب میں کب پریشان ہو سکتا ہے۔ اور ملحد پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کی پریشانی کی کوئی حد ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کو اسباب پر اعتماد تھا اور اسباب اس کے مخالف۔ تو اب اس کے پاس کوئی سہارا نہیں اور موحد کو خدا پر اعتماد ہے اور خدا کو وہ اپنا مخالف نہیں سمجھتا۔ بلکہ مولیٰ اور آقا سمجھتا ہے۔ اس کو اسباب کے مخالف ہو جانے پر بھی یہ امید ہے کہ شاید حق تعالیٰ اسباب مخالف کو موافق بنا دیں۔ اور اگر اسباب مخالف ہی رہے اور اس کو ناکامیابی بھی ہو جاوے تب بھی وہ راضی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو بات بھی آتی ہے اس میں خیر ہی ہوتی ہے پس اس صورت میں اگر دنیا کا ضرر ہوا تو میری آخرت کی ترقی ہوگی قُلْ ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ۔ موحد کے لئے مصائب میں بھی فائدہ ہی ہے اور تکلیف سے بھی خوش ہوتا ہے۔ جیسے بچہ دودھ چھوٹنے کے وقت گو پریشان ہوتا ہے اور اس وقت اس کو بہت تکلیف ہوتی ہے مگر بعد میں ماں کو دعا دیتا ہے ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی مرا با جان جاں ہمراز کردی

وہ کہتا ہے کہ اس ماں کا خدا بھلا کرے جس نے دودھ چھڑا کر مجھے اس قابل کر دیا کہ آج میں پلاؤ زردہ، قورمہ اور کباب کھا رہا ہوں اگر دودھ ہی پیتا رہتا تو یہ نفیس ولذیذ غذائیں کیونکر کھاتا۔

اسی طرح موحد کو مصیبت کے وقت گو ظاہر میں تکلیف ہوتی ہے مگر تکلیف کے بعد جب اپنی ترقی کا احساس ہوتا ہے تو وہ خوش ہو کر یوں کہتا ہے ؎

؎ ناخوش تو خوش بود بر جان من!
دل فدائے یار دل رنجان من!

اور موحد عارف کو تو عین مصیبت کے وقت اس کی حکمتیں اور اپنی ترقی محسوس ہوتی ہے اسلئے وہ تکلیف بھی لذیذ ہو جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر مصیبت لوگوں کی نظر میں موت ہے۔ یہ منتہی المصائب ہے کہ وہ تمام مصائب کا انتہائی درجہ ہے اور اسی کے اندیشہ سے آدمی

تمام مصائب سے گھبراتا ہے مگر عارف موحد کے نزدیک یہ زہر کا پیالہ بھی شیریں ہے وہ کہتا ہے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

(ایضاً ص۲۴ تا ۳۰ محصًا)

۴۷ - مولوی لوگوں کو کافر بتاتے ہیں۔

یہ لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی لوگوں کو کافر بناتے ہیں میں اس کے جواب میں کہتا ہوں کہ مولوی بناتے نہیں بلکہ کافر بتاتے ہیں۔ یعنی جو شخص حرکتوں سے کافر بن جاتا ہے مولوی اس کے کفر کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جیسے کسی کے کپڑے میں پاخانہ لگا ہوا ہو اور دوسرا شخص اس سے کہدے کہ آپ کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے اس کو دھو لیجئے۔ تو کہیئے! اس نے پاخانہ لگایا یا پاخانہ لگا ہوا بتایا۔ پس آپ کا مولویوں پر جھلانا ایسا ہی ہے جیسا وہ شخص جس کے کپڑے میں پاخانہ لگ رہا ہے۔ بتلانے والے کو دھمکانے لگے کہ واہ صاحب تم ہمارے لباس میں پاخانہ لگاتے ہو۔ وہ کہے گا بیوقوف میں نے لگایا نہیں نہ میرے پاس پاخانہ موجود ہے جو میں لگاتا۔ تو نے خود اپنی بے احتیاطی سے کہیں سے لگا لیا ہے میں نے تو تجھے اطلاع کر دی ہے۔ کہیئے ان دونوں میں کون حق پر ہے۔ دیکھو کافر بنانا تو یہ ہے کہ کسی کو کفر کی تلقین کی جائے۔ جیسے مسلمان بنانا یہ ہے کہ کسی کو اسلام کی تلقین کی جائے۔ تو جس طرح ہم کافروں کو اسلام کی تلقین کر کے مسلمان بناتے ہیں کیا اسی طرح کسی مسلمان کو تلقین کفر کرتے ہوئے آپ نے کسی مولوی کو دیکھا ہے۔ کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ پس یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ مولوی کافر بناتے ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ وہ کافر بتاتے ہیں۔

(تقلیل الاختلاط مع الانام ص۲۶)

۴۸ - عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں ہے جتنی شریعت خیر خواہ ہے -

آجکل ہر بات میں عقل پرستی کا دور ہے ہر معاملہ میں اسی کو فیصلہ کے لئے حکم بنایا جاتا ہے - حتیٰ کہ شرعیات میں بھی اور شرعیات میں سے معادیں بھی اور پھر عقل کونسی وہ جو دنیا کے معاملات میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے - تعجب ہے اس کو حکم بنایا گیا ایسے عظیم فیصلہ کے لئے - اور تمنا کی جاتی ہے کہ اگر عقل کے موافق احکام ہوتے تو خوب ہوتا لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بڑی مصیبت ہوتی کیونکہ اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو عقل ہماری اتنی خیر خواہ نہیں جتنی شریعت خیر خواہ ہے - دیکھئے اسی مقام پر عقل کا فتویٰ تو یہ ہے کہ استحضار تصدیق دواماً ضروری ہو ایک ساعت بھی غفلت جائز نہ ہو جیساکہ ایک بزرگ غلبہ میں فرماتے ہیں ؎

؎ ہر آنکہ غافل از حق یک زمان است
در آں دم کافر است امانہاں است

یہاں کافر سے کافر اصطلاحی مراد ہے - یعنی مؤمن کامل کے مقابل - اور کامل بھی کیسا ہو جو اکملیت کے درجے سے پہونچا ہوا ہو کیونکہ کمال کے بھی درجات مختلف ہیں اور ایک درجہ کامل کا ہے اور ایک اکمل کا - اور پھر اکملیت کے بھی مختلف درجے ہیں -

خلاصہ یہ کہ جو حق تعالیٰ کو ہر وقت یاد رکھے وہ مومن اکمل ہے - اس کے مقابلہ میں جو شخص یاد حق میں غفلت کرے اسے اضافۃً کافر کہہ دیا ہے - اس سے حقیقی اور فقہی کافر مراد نہیں

غرض غلبہ حال جو اقتضا ہے کہ استحضار دواماً ہو عقل کا بھی وہی اقتضا ہے تو اگر شریعت مقدسہ نہ ہوتی اور محض عقل ہی حاکم ہوتی تو وہ سب کو عاصی قرار دیتی - شریعت مقدسہ نے یہ رحمت فرمائی کہ آپ کے ذہول کی اجازت دیدی اور عدم تصدیق کو بھی جبکہ تکذیب نہ ہو تصدیق کا قائم مقام کر دیا - اب بتایئے عقل زیادہ خیر خواہ ہوئی یا شریعت مقدسہ - یہ ان عقل پرستوں کو خطاب ہے جن پر سائنس کا غلبہ ہے اور عقل کو شرع پر ترجیح دیتے ہیں -

(آثار العبادة صـ۶)

۴۹ - کفار کا مال دبا لینا حلال نہیں ہے

آجکل اجتہاد کا زور ہے حتیٰ کہ کافر بھی مجتہد ہونے لگے ہیں خواہ وہ یورپ کا ہو یا ہندوستان کا - تو شاید کوئی ایسا ہی مجتہد یوں کہنے لگے کہ حدیث میں تو مسلم کی قید ہے تو مسلمان کا مال تو بدون طیب قلب کے حلال نہیں ہوگا لیکن کافر کا تو ضرور حلال ہے - اور پھر شاید اس استدلال سے منتفع ہو کر ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی نہیں ہے غیر مسلم اس کے مالک ہیں خواہ اس کے پاس ٹھیکہ ہے اور بعض لوگ اسے سرکاری سمجھ کر یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم گورنمنٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہیں -

یہ مسئلہ بھی بجائے خود قابل بحث ہے کہ غیر جنس سے حق وصول کرنا جائز ہے یا نہیں مگر بہت بہت لوگ اس جگہ مسلم کی قید دیکھ کر یوں سمجھے ہوں گے کہ کافروں کا مال لینے میں مطلقاً کچھ جرم نہیں خواہ اس پر ہمارا حق ہو یا نہ ہو کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم کا مال جبراً لینے کو منع فرمایا ہے -

اس کا جواب ظاہر تو یہ ہے کہ یہ قید اتفاقی ہے کہ عادۃً مسلمانوں کو سابقہ مسلمان ہی سے پڑتا ہے ورنہ نصوص عامہ کی وجہ سے اس طرح کسی کا بھی حلال نہیں - چنانچہ بعض احادیث وعید میں الرجل یقطع مال الرجل آیا ہے - (رواه فی الترغیب عن الحاکم وقال صحیح علی شرطهما)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ کافر ذمی اور کافر مسالم حقوق ظاہرہ اور معاملات میں شرعاً مثل مسلمان کے ہے - لهم مالنا وعليهم ما علينا البتہ کافر محارب کا مال مباح ہے مگر وہاں بھی فریب اور غدر جائز نہیں اور مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق ایک عجیب بات فرمائی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے چنانچہ مولانا نے فرمایا کہ بھئی اگر کسی کا حق ہی رکھنا ہو تو مسلمان کا رکھے کافر کا نہ رکھے کیونکہ قیامت میں ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دی جاویں گی - تو اگر کسی مسلمان پر ظلم کیا تو نماز روزہ ظالم کا اس کے بھائی ہی کو ملے گا - خیر اگر ظاہر میں ظلم کیا تو باطن میں قومی ہمدردی بھی تو کی کہ اپنی نیکیاں اسے دے دیں - اور اگر کافر کا حق رکھا تو ایک تو اپنی نیکیاں پرائے گھر - پھر اس صورت میں نہ تمہارا بھلا نہ اس کا بھلا - کیونکہ وہ تو پھر بھی جہنم ہی میں گیا - اگر کوئی کہے کہ پھر اسے کیا نفع ہوا جب نیکیاں اس کے کارآمد

نہ ہوئیں ۔ جواب یہ ہے کہ نفع تو ہوگا مگر اتنا کم ہوگا کہ اسے محسوس نہ ہوگا جیسے کسی کے پاس من بھر سونے کا ایک ڈھیر ہے اور اس میں سے کسی نے ایک رتی بھر سونا چرالیا تو واقع میں تو کمی ہوئی مگر محسوس نہ ہوگی لیکن اس سے کوئی عاقل اور عادل اس کی اجازت نہ دے گا کہ اتنا سا چرالیا کرد ۔ مثلاً کسی سلطنت میں دودھ کے اندر پانی ملانے کی اجازت نہ ہو اور اگر کوئی یہ کہہ کر ملادے کہ ایک من میں ایک لوٹا کیا معلوم ہوگا ۔ تو کیا یہ جرم نہیں ۔ یقیناً جرم ہے اگر اطلاع ہوجاوے تو ضرور سزا ہوگی ۔ مگر اکثر اطلاع نہیں ہوتی ۔ کیونکہ اس کا احساس کم ہوتا ہے ۔ مگر عدم احساس سے بطلان شئ تو لازم نہیں آتا ۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے نفع کا احساس نہ ہو مگر سزا میں کچھ تخفیف ہوگئی ہو تو اس سے نفع کا بطلان لازم نہیں آتا ۔ اسی طرح کافر کے عذاب میں بھی تخفیف ہوگی گو اسے خفت کا احساس نہ ہو ۔

اگر کوئی کہے کہ قرآن میں تو ہے ۔ لایخفف عنہم العذاب کہ ان کے عذاب میں تخفیف نہ کی جاویگی اور تم کہتے ہو کہ نیکیاں ملنے سے عذاب میں خفت ہوگی ، یہ متعارض ہوا ۔

اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ایسی تخفیف نہ ہوگی جس سے راحت محسوس ہو ۔ باقی یہ مطلب ان پر آیت کا نہیں کہ سب کفار کو برابر عذاب ہوگا اور کسی کا عذاب کسی سے کم نہ ہوگا ۔ کیونکہ جس طرح معذبین کے اعمال مراتب میں متفاوت ہیں کہ بعضے کافر کفر میں اشد اور اخلاق میں سخت ہیں ۔ اور بعضے ایسے نہیں ۔ اسی طرح عذاب کے بھی درجات مختلف ہیں ۔ یہ نہیں کہ فرعون اور شداد اور نمرود کے برابر اس کافر کو بھی عذاب ہوگا ۔ جو غریب مسکین مظلوم تھا تو جیسے کفر کے مراتب اور کفار کے درجات ہیں ۔ اسی فرق مراتب کے اعتبار سے عذاب میں بھی فرق ہوگا کہ ایک کو جتنا عذاب ہوگا کسی کو اس کا ضِعف ہوگا اور کسی کو ضعفین ، اور یہ سب فرق قرآن میں آیا ہے ۔ البتہ جس کے لئے جتنا عذاب دخول جہنم کے وقت تجویز ہوجائے گا پھر اس میں کمی نہ ہوگی اور یہ دوسرا جواب ہے پس مطلق خفت کی نفی نہیں ہے بلکہ عذاب مجوزہ میں خفت کی نفی ہے ۔

بہرحال مولانا کی تقریر سے معلوم ہوا کہ کافر کا مال لینا مسلمان کے مال لینے سے بھی زیادہ برا ہے ۔

اب تیسرا جواب سنئے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عادل امت سے یہ احتمال ہی نہ تھا کہ کوئی مسلمان کسی کافر کو نقصان پہونچائے گا اگر کرے گا تو اپنے بھائی ہی کی گلو تراشی کرے گا ۔ کیونکہ عام طور پر اس وقت لوگوں کا خیال یہ تھا ۔ ع ۔

ع ۔ خانۂ دوستان بروب و در دشمناں مکوب ،،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس سے بھی روک دیا ۔ جس سے اب خانۂ دوستاں بروب کی بھی گنجائش نہ رہی ۔ اس کی اس لئے تشریح کردی کہ شاید اس قول سے ظاہر پر عمل کرنے لگے ۔ اب ایسے شخص کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر وہ دوست بھی اس پر عمل کرے اور جو کچھ آپ اس کے گھر سے لائے ہیں وہ بھی اور جو آپ کے گھر کا ہے وہ بھی سب لیجائے تو کیا آپ کو گوارا کرنا پڑے گا اگر گوارا نہیں تو ایسا ہی دوسرے کو بھی سمجھ لیجئے ۔ (اسرار العبادۃ ص۱۶)

۵۰ - تقدیر پر اعتقاد رکھنے سے دنیا میں راحت رہتی ہے اور انکار سے پریشانی بڑھتی رہتی ہے !

اعتقاد تقدیر کی تعلیم سے فلاح آخرت کے ساتھ یہ بھی مقصود ہے کہ مسلمانوں کو دنیا میں راحت رہے کہ کسی چیز کے فوت ہونے سے ان کو زیادہ رنج نہ ہوا کرے ۔ بلکہ یہ سمجھ کر کہ تقدیر میں یوں ہی تھا ۔ صبر و شکر سے کام لیا کریں ۔ اب آپ دیکھ لیں کہ اعتقاد تقدیر کا یہ اثر ہمارے اندر کتنا ہے ۔ سو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ ہم مصائب و حوادث میں ضعفِ قلب اور قلتِ اعتقاد کی وجہ سے ایسے ہی پریشان ہوجاتے ہیں جیسا ایک دہری یا منکر تقدیر پریشان ہوتا ہے ۔

صاحبو ! اگر تقدیر پر کامل اعتقاد ہے تو اس کا اثر ظاہر میں بھی تو کچھ ہونا چاہیئے ۔ یاد رکھو محض زبان سے اتنا کہدینا تو آسان ہے کہ ہم کو تقدیر پر اعتقاد ہے ۔ مگر امتحان کے وقت ہر شخص کی قلعی کھل جاتی ہے اور امتحان کا وقت یہی ہے جب کہ مصائب و حوادث کا نزول ہو رہا ہو اور کسی کی قلعی بھی نہ کھلے ۔ تب بھی حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہے وہاں تو کوئی حیلہ نہیں چل سکتا ۔

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ۔۔۔ در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

کارہا با خلق آری جملہ راست ۔۔۔ با خدا تزویر و حیلہ کے رواست

کارہا او راست باید داشتن ۔۔۔ رائت اخلاص و صدق افراشتن

صاحبو ! جو شخص سچ مچ تقدیر کا معتقد ہے اس کو رنج و غم کبھی نہیں ہوتا اور جو کبھی کبھی آپ ان کو مصائب میں دیکھتے ہیں یہ نظر بد سے بچانے کے لئے صورت رنج و غم ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں ۔

دل ہمی گوید از و رنجیدہ ام — وز نفاق سست او خندہ ام

ان کو ان مصائب سے ایسی کلفت ہوتی ہے جیسے مرچوں کو کھانے والوں کو کلفت ہوتی ہے کہ ظاہر میں آنسو جاری ہیں مگر دل میں ہنس رہا ہے اور مزے لے لے کر کھا رہا ہے ان کو اس میں ایسی لذت آتی ہے کہ سلطنت کے بدلے میں بھی اپنی تنگ نظری اور فقر وفاقہ وغیرہ کو دینا نہیں چاہیئے۔

ایک بزرگ کی حکایت

چنانچہ ایک بزرگ کی حکایت ہے کہ وہ ایک شہر کے دروازے پر پہونچے۔ دیکھا کہ شہر پناہ کا دروازہ بند ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ دن میں دروازہ کیوں بند کیا گیا۔ کیا کسی دشمن کا خطرہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ بلکہ بادشاہ کا باز اڑ گیا ہے۔ اس لئے دروازہ بند کر دیا کہیں دروازہ سے نکل نہ جائے۔ یہ سنکر آپ بہت ہنسے اور سمجھ گئے کہ بادشاہ محض احمق ہے بھلا باز کو دروازہ سے نکلنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو اوپر سے بھی جا سکتا ہے اس کے بعد آپ نے بطور ناز کے حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ سبحان اللہ یہ تو اتنا احمق اور اس کو بادشاہ بنا دیا۔ اور ہم ایسے عاقل اور عارف اور ہماری یہ حالت ہے کہ پیر میں جوتی بھی سالم نہیں، بدن پر کپڑے بھی درست نہیں۔ ان بزرگ کا مقام ادلال کا تھا۔ مگر ناز ہر وقت نہیں چلتا۔ کیونکہ کبھی وہ بھی ناز کرنے لگتے ہیں، یہ کیا کہ تم ناز کرو۔ اور وہ کبھی نہ کریں۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔ بہت اچھا، کیا تم اسی پر راضی ہو کہ اس بادشاہ کی حماقت وجہالت مع سلطنت کے تم کو دے دی جاوے اور تمہاری معرفت ومحبت مع فقر وتنگدستی وخستہ حالی اس کو دے دی جاوے۔ یہ جواب سن کر وہ بزرگ کانپ اٹھے۔ اور فوراً سجدہ میں گر پڑے کہ میں اس گستاخی سے توبہ کرتا ہوں اور اس تبادل پر ہرگز راضی نہیں۔

تو حضرت وہ ایسا درد ہے کہ اگر کوئی ان کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر ان پر ترس کھائے اور اس سے نجات اور سکون کی دعا کرے کہ خدا تم کو اس غم سے نجات دے تو وہ یوں کہتے ہیں ؎

مصلحت نیست مرا سیری ازاں آبِ حیات — ضاعف اللہ بہ کل زمانٍ عطشی

مجنون کا حال

اور کیوں نہ ہو یہ تو محبوب حقیقی کے عاشق ہیں۔ مجنون نے تو ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت کے غم سے بھی نجات نہیں چاہی۔ جب اس کا عشق مشتہر ہوا اور سوز وگداز سے کھانا پینا متروک ہو گیا اور دیوانوں کی طرح جنگلوں میں پھرنے لگا۔ تو اس کا باپ اس کو مکہ معظمہ میں لایا اور کہا بیت اللہ کا پردہ پکڑ کر خدا سے دعا کر کہ لیلیٰ کی محبت میرے دل سے نکال دے تو اس نے رو کر کہا ؎

یَا رَبِّ لَا تَسْلُبَنِّیْ حُبَّهَا اَبَدًا — وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ اٰمِيْنَا

اور کہا ؎

اِلٰهِیْ تُبْتُ مِنْ كُلِّ الْمَعَاصِیْ — وَلٰكِنْ حُبَّ لَيْلٰى لَا اَتُوْبُ

تو جب ایک ادنیٰ مخلوق کی محبت میں غم لذیذ ہو جاتا ہے۔ تو حق تعالیٰ کے عشاق کو اگر مصائب میں راحت ہو تو کیا عجب ہے۔ اب اس کو غم کہنا ہی غلط ہے وہ واقع میں غم نہیں محض صورت غم ہے اس کا شریعت مقدسہ پر عمل کرنے والے پر کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتا۔ یا اس کا کوئی عزیز نہیں مرتا۔ یا اس کا دنیاوی نقصان نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ اسے پیش آتا ہے اور اس سے کلفت بھی اس کو ہوتی ہے مگر پریشانی اور حقیقی غم نہیں ہوتا۔ کیونکہ غم کہتے ہیں دل کی گھٹن کو۔ اور کلفت کہتے ہیں الم دکھن کو۔ اہل اللہ کو مصائب میں الم ہوتا ہے مگر گھٹن نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر تمہارے زخم میں نشتر لگائے۔ اس وقت تم کو الم تو ہوگا مگر رنج وغم نہ ہوگا گو ظاہر میں ہائے ہائے بھی کر دگے مگر دل اندر سے خوش ہوگا اور اس الم پر راضی ہوگا کیونکہ تم اس نشتر کو حکمت سے موافق سمجھتے اور اپنے لئے نافع ومفید خیال کرتے ہو۔

یہی حال اہل اللہ کا ہے۔ زمانے کی مصائب وحوادث کے ساتھ کہ وہ ان کو عین حکمت اور سراپا مصلحت سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہر حال میں خوش ہیں اور یوں کہتے ہیں ؎

؎ نکل جائے دم تیرے قدموں کے نیچے — یہی دل کی حسرت یہی آرزو ہے

غرض جو لوگ شریعت مقدسہ کی تعلیم پر عمل کرنے والے ہیں ان کو غم حقیقی ہوتا ہی نہیں پس اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ؏ اپنی حقیقت پر ہے۔ اس میں تاویل کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو حقیقی خوف وحزن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تقدیر پر پورا ایمان رکھتے ہیں جس کا اثر یہی ہے کہ رنج وغم اور تجویز کی جڑ کٹ جاتی ہے جیسا کہ میں نے ابھی اس سے ثابت کیا تھا۔ لکی لا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما اٰتکم پس قائل تقدیر کو آخرت میں تو خوف وحزن ہوہی گا نہیں۔ دنیا میں بھی اس کو غم نہیں ہوتا۔ اس لئے لاخوف علیھم ولاھم یحزنون ہر حال میں اپنی حقیقت پر ہے اور جو شخص تقدیر کے اعتقاد سے خالی ہے اس کو دنیا میں غم ہے اور آخرت میں بھی۔ اور جس کا اعتقاد ضعیف ہے وہ آخرت میں تو پٹ چھٹ کر جنت میں پہونچ جائے گا مگر دنیا میں عمر بھر ضرور بے چین رہے گا۔ تو کیا اچھا ہو کہ یہاں بھی راحت ہی ہو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنے عمل واعتقاد کو کامل کرو۔ پھر تمہارے لئے دنیا میں بھی چین ہوگی۔

لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا وفی الاخرۃ۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو اس چین کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہم کو بے چینی ہی منظور ہے تو یہ شخص قابل خطاب نہیں پھر ہم تو جب جانتے کہ یہ لوگ دنیا کی چیزوں سے بھی صبر کر لیتے مگر یہاں تو یہ حالت ہے کہ چار پیسوں سے بھی صبر نہیں اور آخرت کے بارے میں ایسی ہمت ہے کہ وہاں کی راحت اور دنیا کی حیاۃ طیبہ سے صبر ہے اس کا نام صوفیہ کے محاورات میں صبر فرعون ہے۔ مولانا اس کی شکایت فرماتے ہیں ؎

ایکہ صبرت نیست از فرزند و زن — صبر چوں داری ز رب ذوالمنن

اے کہ صبرت نیست از دنیائے دوں — صبر چوں داری زنعم الماہدون

(خیر الحیوٰۃ وخیر الممات ص ۱۱۰،۱۱۱)

۵۱ - روح کو موت نہیں آتی جسم عنصری کو آتی ہے

یاد رکھو موت صرف جسم عنصری کو آتی ہے روح کو موت نہیں آتی بلکہ موت سے صرف اس کا تعلق جسم عنصری سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد یہ سمجھو کہ لذات سے منقطع ہونے والا کون ہے کیا آپ کے نزدیک یہ بدن ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ روح منتفع و متلذذ ہوتی ہے اور جسم اس کے لئے بمنزلہ آلہ و مرکب کے ہے اور یہ روح موت کے بعد بھی علیٰ حالہ باقی رہتا ہے۔ بلکہ اب اس کی قوت پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہے تو موت کے بعد وہ اس عالم کے لذات سے متلذذ ہوتی ہے۔ اور اگر تم یہ سمجھو کہ میری حقیقت تو محض جسم کی ہے۔ تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کوئی گدھا پر سوار ہو کر یوں سمجھے کہ میں گدھا ہوں۔ سو اس کا تو کوئی علاج نہیں صاحب آپ کی حقیقت وہ ہے جس کو آپ "میں" تعبیر کرتے ہیں کہ میں نے یہ کیا میں نے وہ کیا۔ اب آپ غور کیجئے کہ اس "میں" کا مصداق کیا چیز ہے؟ کیا آنکھ، ناک یا منہ اور ہاتھ پیر کو "میں" کا مصداق کہہ سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ ورنہ چاہیئے کہ ان اعضاء کے جاتے رہنے سے انسان ہی جاتا رہے اور یہ غلط ہے۔ رہے اور اعضائے شریفہ اور قوائے شریفہ جیسے قلب اور عقل وغیرہ ممکن ہے کہ آپ ان کو "میں" کا مصداق کہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اس کا مصداق نہیں ہے۔ کیونکہ آپ ان کو اپنی طرف مضاف کرتے ہیں کہ میرا دل کمزور ہو گیا یا میری عقل میں یوں آتا

ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اضافت علامت مغائرت ہے تو معلوم ہوا کہ یہ بھی آپ کی حقیقت نہیں بلکہ حقیقت آپ کی روح ہے اور گو وہاں بھی اضافت ہوتی ہے کہ میری روح مگر چونکہ مستقل دلائل سے ثابت ہے کہ یہ حقیقت ہے اس لئے یہ اضافت مجازیہ ہے۔ اور دوسرے اعضاء و قویٰ میں کوئی ایسی دلیل نہیں بلکہ خلاف پر دلیل قائم ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ میں بچپن میں عقل نہیں ہوتی اور آپ ہوتے ہیں۔ ایک وقت میں یعنی بعد مدت قلب نہ رہے گا اور آپ ہوں گے صاف دلیل ہے کہ آپ کی حقیقت یہ سب چیزیں نہیں۔ اس لئے یہ اضافت حقیقیہ ہے۔

بہر حال آپ کی حقیقت روح ہے اور اس پر موت نہیں آتی بلکہ وہ بجنسہ موت کے بعد اپنے حال رہتی ہے اور اب بجائے اس جسم کے جو موت کے بعد فناء اور شکستہ ہو جاتا ہے۔ روح کا مرکب دوسرا جسم بنتا ہے جس کو جسم مثالی کہتے ہیں۔ اب روح اس جسم کے ذریعے سے سارے انتفاعات و تلذذات حاصل کرتی ہے اور یہ جسم مثالی وہ نسمہ ہے جس کو متکلمین اہل ظاہر روح کہتے ہیں یعنی موت کے وقت جو چیز جسم عنصری سے الگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے وہ نسمہ ہے اور یہ بھی مادی چیز ہے مگر اس کا مادہ لطیف ہے۔ اور اس کو اس جسم عنصری کے ساتھ ایسا حلولی تعلق ہے جیسا جسم تعلیمی کا تعلق جسم طبعی کے ساتھ حکماء نے بیان کیا ہے یعنی وہ نسمہ مقدار اور ہیئت و شکل میں بالکل جسم عنصری کے برابر ہے۔ اور وجہ تشبیہ یہی ہے ورنہ جسم تعلیمی تو عرض ہے اور نہ جوہر۔ اور یہ نسمہ اس وقت یعنی زندگی میں اس کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے اور موت کے وقت وہ الگ ہو جاتا ہے یہی جسم مثالی ہے جو موت کے بعد روح حقیقی کا مرکب بنتا ہے اور یہ جسم مثالی گو مادی ہے مگر اس جسم سے زیادہ لطیف و قویٰ ہے اور روح حقیقی جو حقیقت میں انسان ہے وہ مادہ سے بالکل مجرد ہے۔ وہ نہ اس وقت جسم کے اندر ہے نہ موت کے وقت اس سے الگ ہو بلکہ وہ تو محض جسم کی مدبر ہے جو اب بھی بدن سے الگ ہی ہے اور اس کی تدبیر کر رہی ہے اور گو متکلمین نے روح کے تجرد کا انکار کیا ہے مگر اس بارے میں فلاسفہ کا قول راجح ہے دلائل سے قوت انہی کے قول کو ہے اور صوفیہ کا کشف بھی اسی کے موافق ہے کہ روح حقیقی مادہ سے مجرد ہے۔ البتہ فلاسفہ کا اس کو قدیم کہنا جیسا قدماء کا قول ہے یا حادث بعد حدوث البدن کہنا جیسا مشائین کا قول ہے یہ بالکل غلط اور خلاف نصوص ہے اور متکلمین نے جس چیز کو روح سمجھ کر مادی کہا ہے وہ دراصل روح حقیقی نہیں بلکہ نسمہ ہے جو مرکب روح ہے۔ غرض یہ ثابت ثابت ہو گئی کہ انسان میں جو اصل چیز ہے۔ وہ حقیقت میں وہی انسان ہے موت کے بعد وہ اپنے حال پر رہتا ہے اس کی قوت

وصفات میں کچھ کمی نہیں آتی بلکہ پہلے سے کچھ ترقی ہوجاتی ہے ۔

اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ گو روح کو موت نہیں آتی مگر جسم سے تو تعلق منقطع ہوجاتا ہے تو جو انتفاعات روح سے تنہا نہیں ہوسکتے تو اب وہ نہ ہوسکیں گے ۔ اس کا جواب بھی معلوم ہوگیا کہ موت کے بعد جسم مثالی مرکب بنتا ہے جو اس جسم عنصری سے لطیف اور قوی تر ہے وہ سب لذات سے منتفع ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں یہاں کی لذات ہیچ ہیں اور روح ان سے متلذذ ہے ۔ کھانا بھی ۔ پینا بھی، سیر و تماشا بھی، ملاقات احباب بھی ، مکانات اور باغات بھی وغیرہ وغیرہ ، اس حقیقت کا مراقبہ کرکے موت کا دھیان کرو ، تو انشاء اللہ موت سے وحشت نہ ہوگی بلکہ اس کا شوق پیدا ہوگا ۔ اور یوں کہو گے ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم — راحت جاں طلبم و زپے جاں بردم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

(خیر الحیات و خیر الممات ص ۳۴ تا ۳۶)

۵۲ - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت آخرت میں کفار کے لئے

ایک رحمت عامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہے کہ اس امت کے اوپر سے سخت عذاب ٹل گئے ہیں جو پہلی امتوں پر آئے تھے کہ بعض قومیں سور بندر بنادی گئیں ۔ جس کا تختہ الٹ گیا ۔ کسی پر آسمان سے پتھر برسے ۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تو برکت ہے کہ اس امت کے کفار پر ایسے عذاب نہیں آتے ۔

اور اس رحمت کو عام اس لئے کہا گیا کہ کفار کو بھی شامل ہے جو کہ امت دعوت میں داخل ہیں

اب یہاں یہ ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ دنیا میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے حق میں رحمت عامہ ہونا ثابت ہوگیا ۔ مگر آخرت میں کفار کے لئے آپ کی رحمت کیا ہوگی کیونکہ وہ کفار تو ابد الآباد کے لئے جہنم میں رہیں گے ۔ ان کے حق میں آپ کی رحمت کا ظہور کس طرح ہوگا ۔ اسی طرح جن مومنین کی بعد سزا کے مغفرت ہوگی ان کے حق میں آپ کی رحمت کیا ظاہر ہوئی ۔

اس کے جواب کے لئے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے اس کے سمجھنے کے بعد معلوم ہوجائے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کا ظہور کفار کے حق میں آخرت میں بھی ہوگا ۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ بھلا اگر کوئی شخص بڑا سخت جرم کرے جس کی سزا میں وہ بیس سال کی سزائے قید کا مستحق ہوا اور اس میں سے کچھ تخفیف کردی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں ۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بہت سخت سزا کا مستحق ہو اور اس میں سے کچھ تخفیف کردی جائے تو یہ بھی رحمت ہوگی یا نہیں ۔ ظاہر ہے کہ دونوں صورتیں رحمت میں داخل ہیں ۔

اب سمجھئے کہ قیامت کے روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن گنہ گار مسلمانوں کے لئے جو کہ جہنم میں جائیں سفارش فرمائیں گے ۔ اگر یہ شفاعت نہ ہوئی تو ان کی میعاد اور زیادہ ہوئی ۔ تو میعاد کی کمی یہ رحمت سے ہوئی ۔ کوئی ہزار برس کے عتاب کا مستحق تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے اس میں کمی کردی جاوے ۔ مثلاً پانچسو برس کے بعد وہ جہنم سے نکالدیا جاوے تو رحمت ہونا اس کا ظاہر ہے ۔ اور کفار کے حق میں یہ تو نہیں ہوسکتا کہ میعاد میں کمی کردی جاوے ۔ عذاب تو ان کو ابد الآباد تک ہوگا مگر بقول شیخ عبد الحق محدث دہلوی جو عنقریب آتا ہے عذاب میں تخفیف کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں بھی شفاعت فرمائیں گے چنانچہ بعض کفار کے لئے حضور کی برکت سے تخفیف عذاب کا ذکر تو صحاح میں بھی آتا ہے کہ صحابی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ابوطالب کو کچھ آپ کی خدمت سے نفع بھی ہوگا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں نہ ہوتا ابو طالب سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوتے ۔ مگر میری وجہ سے یہ ہوا کہ ان کو صرف دو جوتیاں آگ کی پہنائی جائیں گی جس سے ان کا بھیجا مثل ہانڈی کے پکے گا اور اس پر بھی یہ سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں ۔ ابولہب کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ چونکہ انہوں نے حضور کی ولادت شریفہ کی خوشی میں بشارت لانے والی باندی کو آزاد کردیا تھا ۔ ہر پیر کے دن ذرا سا ٹھنڈا پانی پینے کو مل جاتا ہے ۔

کفار کے حق میں سفارش کی نوعیت باقی عام کفار کے حق میں تخفیف کی شفاعت مجھے کسی حدیث سے تو معلوم نہیں ہوئی مگر شیخ عبد الحق محدث رحمہ اللہ نے اپنی ایک کتاب اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے کہ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت دس طرح کی ہوگی ان میں ایک شفاعت ایسی ہوگی کہ حضور عام کفار کے لئے شفاعت فرمائیں گے کہ یہ لوگ جس عذاب کے مستحق ہیں اس میں کچھ کمی کردی جاوے ۔ چنانچہ آپکی

برکت سے ان کے عذاب میں کمی کردی جاوے گی، گو کم ہونے لگے بعد بھی وہ اس قدر سخت ہوگا کہ وہ اس کو بھی بہت سمجھیں گے ۔ خدا محفوظ رکھے ۔ وہاں تو ذرا سا عذاب بھی ایسا ہوگا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ مجھ سے زیادہ عذاب کسی کو نہیں۔ چنانچہ ابو طالب کو حالانکہ بہت ہی کم عذاب ہوگا ۔ مگر وہ یہی سمجھیں گے کہ مجھ سے زیادہ کسی کو بھی عذاب نہیں تو گو کفار کو اس کمی کا احساس نہ ہو مگر حضور کی طرف سے تو رحمت ہونے میں شک نہیں رہا آپ کی رحمت تو ان کے ساتھ بھی پائی گئی ۔ اور چونکہ شیخ عبد الحق رحمہ اللہ بڑے محدث ہیں اس لئے انہوں نے جو یہ دس قسمیں شفاعت کی لکھی ہیں کسی حدیث سے معلوم کر کے لکھی ہوں گی گو ہم کو وہ حدیث نہیں ملی ۔ مگر چونکہ شیخ کی نظر حدیث میں بہت وسیع ہے اسلئے ان کا یہ قول قابل تسلیم ہے ۔ اور شیخ کے اس قول پر یہ اشکال نہ کیا جاوے کہ یہ نص کے خلاف ہے قرآن میں تو کفار کے بارے میں ارشاد ہے لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ کہ کفار سے عذاب کم نہ کیا جاوے گا۔ اور شیخ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے حق میں تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائیں گے ، دونوں میں تعارض ہوگیا۔ بات یہ ہے کہ آیت کا یہ مطلب کہ جس قدر عذاب آخرت میں ان کے لئے طے ہوگا پھر اس سے کمی نہ کی جاوے گی اور یہ اسلئے ارشاد فرمایا گیا تا کہ کوئی آخرت کے عذاب کو دنیا کے عذاب پر قیاس نہ کرے کہ جس طرح دنیا کی آگ کا قاعدہ ہے کہ پہلی پہل بہت تیزی کے ساتھ بھڑکتی ہے پھر کم ہوتے ہوتے ٹھنڈی ہوجاتی ہے ۔ ایسی جہنم کی آگ ہوگی کہ رفتہ رفتہ ہزار دو ہزار سال کے بعد اس کی تیزی کم ہوجائیگی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہاں کی آگ ایسی نہیں جیسی اول دن میں تیز ہوگی ہمیشہ ایسی ہی رہیگی اور یہ مطلب نہیں ہے کہ جس عذاب کے وہ قانوناً مستحق ہوں گے اسی میں بھی کسی کی شفاعت سے بھی کمی نہ ہوگی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس قدر ان کے لئے عذاب طے ہو کر قرار پائے گا ۔ وہ ہمیشہ ایک حال پر رہے گا ۔ زمانہ دراز گذرنے سے اس میں کمی واقع نہ ہوگی ۔ واللہ اعلم

(شکر النعمۃ بذکر رحمۃ الرحمۃ ص تا ۵۱ ملخصاً)

---

۵۳ - مطیع اور غیر مطیع پر مصائب آنے میں فرق ہے

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ باتیں بیماری مقدمہ وغیرہ نمازیوں کو پیش نہیں آتیں ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ نہ بیماری میں تخصیص نمازی اور غیر نمازی کی ہے نہ مقدمہ میں ، نہ اور کسی مصیبت میں میں کہتا ہوں کہ مصائب بیشک پیش آتے ہیں ان کو بھی ، اور اُن کو بھی ، مگر فرق ہے دونوں میں ان کے واسطے مصائب سزا ہیں اور ان کے لئے باعث رفعت مراتب اور موجب قرب ہیں ۔

اس پر شاید کہا جائے کہ یہ تو دل کے سمجھانے کی بات ہے ۔ اور من گھڑت ہے اس کا عکس بھی تو ممکن ہے ۔ جب صورۃً دونوں جگہ یکساں ہیں تو وہ بھی اپنا دل اس طرح خوش کر سکتے ہیں کہ مصیبت جو آئی ہے تو کچھ برا نہیں ۔ ہمارے درجے بلند ہوں گے ۔ جیسے نمازیوں نے اسی طرح دل کو سمجھا لیا تھا ، میں کہتا ہوں واقعیت کسی چیز کی من سمجھوتہ کرنے سے نہیں بدلتی ۔ دعویٰ دونوں فریق اس کا کر سکتے ہیں کہ مصیبت ہمارے لئے رحمت ہے لیکن کسی علامت سے امر واقعی کا پتہ چل جائے تو بات طے ہو سکتی ہے کہ حق کس طرح ہے ۔ وہ علامت یہ ہے کہ خاصہ ہے کہ مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو اس کو پریشانی نہیں ہوتی اور رحمت کی حقیقت یہی ہے ۔ اور مصیبت کی حقیقت پریشانی ہے ۔ اس کو کان میں رکھو اور دونوں منظر دیکھ لو۔ ایک یہی واقعہ کہ جس کو مصیبت کہا جاوے نمازی پر یعنی مطیع پر آوے تو اس کا اس کے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہی واقعہ عارضی پر آوے تو کیا ہوتا ہے زمین آسمان کا فرق ملے گا دونوں میں ۔ اور ذرا سے غور سے نزاع رفع ہوجاوے گا عاصی کا دل ٹوٹ جاتا ہے مصیبت میں اور مطیع کو ڈھارس رہتی ہے ۔ کیونکہ اس کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہے ۔ اور عاصی کے دل کو خدا تعالیٰ سے تعلق حاصل نہیں ۔ تعلق خدا مقوی قلب ہے اور خدا سے تعلق میں یہ اثر کیوں نہ ہو ۔ ایک کلکٹر سے جس کو تعلق ہوتا ہے وہ کسی سے نہیں ڈرتا ۔ پھر جس کو تعلق خدا سے ہو وہ کیسے ڈرے گا اور اس کا دل کیوں ٹوٹے گا اور عاصی کی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کا کوئی سہارا ہوتا ۔ ڈرتا ڈرتا رہتا ہے ۔ یہی تو فرق ہے پولیس اور ڈاکوؤں میں ۔ مقابلہ کے وہ میدان میں دونوں موجود ہیں اور مارنے میں دونوں شریک ہیں ۔ ظاہری نظر دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ دونوں فریق ایک مصیبت میں گرفتار ہیں،

یہ بھی مر رہے ہیں اور وہ بھی مر رہے ہیں تو کسی کو حق پر اور کسی کو ناحق پر کیسے کہیں گے لیکن ذرا غور کیجئے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پولیس مر ضرور رہی ہے مگر دل ان کے مضبوط ہیں اور ان کو ڈھارس بندھی ہوئی ہے۔ اور ڈاکو ہمت پولیس سے بھی زیادہ کر رہے ہیں مگر دل اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں اور پاؤں نہیں جمتے۔ اور موقع دیکھتے ہیں کہ اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں یہ اثر اسی کا ہے کہ پولیس مطیع ہے اور حاکم سے تعلق ہے اور ڈاکو عاصی ہے۔ اس کے دل کو کسی کا سہارا نہیں۔ اس مثال سے عاصی اور مطیع کی حالتوں کا فرق بہت وضوح کے ساتھ معلوم ہوسکتا ہے۔ نمازی اور مطیع پر جب مصیبت آتی ہے تو وہ صبر و سکون کے ساتھ رہتا ہے اور کوئی بیہودہ کلمہ تک اس کے منہ سے نہیں نکلتا۔ اور عاصی پر جب مصیبت آتی ہے تو پوری قیامت ہوتی ہے چیخ پکار اور رونا پیٹنا مچ جاتا ہے زبان سے بیہودہ کلمات بکتا ہے اور دل میں شکایت ہوتی ہے یہ مصیبت جس کو مصیبت کہنا چاہیے یہ کھلی ہوئی علامت ہے اس بات کی کہ تعلق مع اللہ باقی نہیں۔ اور مطیع کا تعلق باقی ہے گو جسمانی تکلیف ہے۔ اور باقتضار طبعی اس کا احساس کرتا ہے اور رنج پاتا ہے مگر دل اندر سے تازہ ہے۔

ایک پادری نے لکھا ہے کہ مسلمان اپنے خدا سے شرمندہ نہیں ہیں اس واسطے شگفتہ رہتے ہیں۔

عاصی اور مطیع کی حالت میں فرق ضرور ہوتا ہے بلکہ ادنیٰ مسلمان کی حالت میں بھی کافر سے فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہے جس کی وجہ سے اس کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے کیونکہ تعلق مع اللہ کچھ نہ کچھ ہر مسلمان کو حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ اسے اس کی حالت کو اس شخص کی حالت سے ضرور فرق ہوتا ہے جس کو بالکل تعلق نہیں یعنی کافر۔ آپ کو نسبت حق سے ضرور حاصل ہے کو آپ کو خبر نہیں ؎

یک سبد پرناں ترا برفرق سر
تو ہمی جوئی لب ناں در بدر
تا بزانو غرق ہستی اندر آب
وز عطش وز جوع گشتی خراب

ہماری وہ حالت ہے کہ ساری دولتیں حاصل ہیں۔ مگر عادت ہوگئی ہے بھیک مانگنے کی ان کی طرف توجہ نہیں اور ادھر ادھر ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ غیروں کی تقلید کرتے ہیں۔ عقائد میں خیالات میں، معاشرت میں، صاحبو! تمہارے پاس تو اتنی دولتیں ہیں کہ دوسرے یہیں سے لے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم ان سے متمتع نہیں ہوتے اور ان سب دولتوں کی اصل تعلق مع اللہ

ہے۔ اگر ہم اس سے کام لیں تو کبھی پریشانی نہ ہو اللہ والا کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ دیکھئے سب سے بڑھ کر حادثہ موت کا ہے اور دیگر مصائب جو مخوف عنہ ہیں تو اس وجہ سے ہیں کہ مقدمہ موت ہیں مگر اہل اللہ کی حالت خود موت کے متعلق یہ ہے کہ بجائے پریشانی کے الٹی راحت ہوتی ہے۔ انہوں نے اس کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے جس کے نام سے دنیا بھاگتی پھرتی ہے۔ ایک صاحب موت کی آرزو میں کہتے ہیں ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں و غزلخواں بروم

(الظاہر ص۳۲)

۵۴۔ قرآن کریم میں ہر پہلو کی رعایت ہے

قرآن کریم میں ہر پہلو کی ایسی رعایت ہے کہ کسی کلام میں ویسی رعایت نہیں ہے قرآن میں صرف ضابطہ کو پورا نہیں کیا گیا۔ اس مضمون کو آپ سہولت سے یوں سمجھیں گے کہ حکام دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ضابطہ کے پابند ہیں۔ ضابطہ کی رو سے جو کام ان پر واجب ہے وہ کر دیا اور قانون کے موافق رعایا پر احکام لازم کر دیئے ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ دشوار احکام کو قانون سے خارج کریں یا ان کے سہل و آسان کرنے کی تدبیر بتائیں۔ دوسرے وہ حکام ہیں جن کو رعایا سے محبت ہوتی ہے اور مخلوق کو راحت پہونچانا چاہتے ہیں اور حتی الامکان قانون میں کوئی دشوار حکم داخل نہیں کرتے اور اگر کسی مصلحت سے کوئی دشوار حکم رکھتے بھی ہیں تو رعایا کو اس کے سہل کرنے کی تدبیر بھی بتلاتے ہیں اور اس تجویز میں ان پر تعب ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ شفقت پر مبنی ہے۔ اتنی رعایتیں وہی حاکم کر سکتا ہے جس کو رعایا پر شفقت ہو۔ اسی طرح ایک اور مثال سمجھئے کہ نصیحت کرنے والا ایک تو استاذ ہوتا ہے اور ایک باپ ہوتا ہے باپ کی نصیحت میں عام لوگوں کی نصیحت سے فرق ہوتا ہے۔ استاذ تو ضابطہ پوری کر دیتا مگر باپ ضابطہ پوری نہیں کر سکتا۔ وہ نصیحت کرتے ہوئے اس کا خیال رکھتا ہے کہ بیٹے کو ایسے عنوان اور ایسے طرز سے نصیحت کردوں جو اس کے دل میں گھر کرے۔ کیونکہ وہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ بیٹے کی اصلاح ہوجائے اور اس میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اور اگر وہ کوئی مشکل کام بھی بتلاتا ہے تو اس کا طریقہ وہ

اختیار کرتا ہے جس سے بیٹے کو عمل آسان ہو جاوے ۔ اور ان سب رعایتوں کا منشا وہی شفقت ہے ۔ شفقت ہی کے ساتھ تمام پہلوؤں کی رعایت کی جاسکتی ہے اور اسی لئے باپ کا کلام نصیحت کے وقت کبھی بے ترتیب بھی ہو جاتا ہے مثلاً باپ بیٹے کو کھانا دیتے ہوئے نصیحت کرے کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس مضمون پر وہ مفصل گفتگو کر رہا ہو۔ اسی درمیان میں اس نے دیکھا کہ بیٹے نے ایک بڑا سا لقمہ کھانے کو لیا ہے تو وہ فوراً نصیحت کو قطع کر کے کہے گا کہ یہ کیا حرکت ہے لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے اس کے بعد پھر پہلی باپ پر گفتگو شروع کر دے گا اب جس کو شفقت کی اطلاع نہ ہو وہ کہے گا کہ یہ کیسا بے ترتیب کلام ہے ۔ بری صحبت سے منع کرنے میں لقمہ کا کیا ذکر ۔ مگر جو شخص کبھی کسی کا باپ بنا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بے ترتیب کلام مرتب و مرتبط کلام سے افضل ہے ۔ شفقت کا مقتضا یہی ہے کہ ایک بات کرتے ہوئے اگر دوسری بات کی ضرورت ہو تو ربط کا لحاظ نہ کرے ۔ دوسری بات کو بیچ میں رکھ کر پھر پہلی بات کو پورا کرے ۔ یہی راز ہے اس کا کہ خدا تعالیٰ کا کلام ظاہر میں کہیں بے ربط بھی معلوم ہوتا ہے ۔ اس ظاہری بے ربطی کا منشا شفقت ہی ہے کہ حق تعالیٰ مصنفین کی طرح گفتگو نہیں کرتے کہ ایک مضمون پر کلام شروع ہو تو دوسرے باپ کا کوئی مضمون اس میں نہ آسکے بلکہ وہ ایک مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اگر کسی دوسرے امر پر تنبیہ کی ضرورت دیکھتے ہیں تو شفقت کی وجہ سے درمیان میں فوراً اسپر بھی تنبیہ فرما دیتے ہیں اس کے بعد پھر پہلا مضمون شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ایک آیت مجھے یاد آئی ہے جس پر لوگوں نے غیر مرتبط ہونے کا اعتراض کیا ہے ۔

قیامت کا حال

سورہ قیامہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کا حال بیان فرمایا ہے کہ انسان اسوقت بڑا پریشان ہوگا اور بھاگنے کا موقعہ ڈھونڈے گا ۔ اپنے اعمال پر اُسے اطلاع ہوگی ۔ اس روز اس کو سب اگلے پچھلے کئے ہوئے کام سب جتلا دیے جائیں گے ۔ پھر فرماتے ہیں ۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ یعنی انسان کا اپنے اعمال سے آگاہ ہونا کچھ اس جتلانے پر موقوف نہ ہوگا ۔ بلکہ اس دن انسان اپنے نفس (کے احوال و اعمال) سے خوب واقف ہے (کیونکہ اس وقت حقائق کا انکشاف ضروری ہو جائے گا) اگرچہ وہ (باقتضائے طبیعت) کتنے ہی بہانے بنائے ۔ جیسے کفار کہیں گے واللہ ہم تو مشرک نہ تھے مگر دل میں خود بھی جانیں گے کہ ہم جھوٹے ہیں ۔

غرض انسان اس روز اپنے سب احوال کو جانتا ہوگا اسلئے یہ جتلانا محض قطع

جواب اور اتمام حجت اور دھمکی کے لئے ہوگا نہ کہ یاد دہانی کے لئے ۔ یہاں تک تو قیامت ہی کے لئے متعلق مضمون ہے ۔ اس کے بعد فرماتے ہیں ۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن نازل ہوتے ہوئے اس کے یاد کرنے کے خیال سے زبان نہ ہلایا کیجئے ۔ ہمارے ذمہ ہے آپ کے دل میں قرآن کا جما دینا اور زبان سے پڑھوا لینا ۔ تو جب ہم قرآن نازل کریں اس وقت فرشتے کی قرأت کا اتباع کیجئے ۔ پھر یہ بھی ہمارے ذمہ ہے کہ آپکو قرآن کا مطلب بھی بیان کر دیں گے ۔ اس کے بعد پھر قیامت کا مضمون ہے ۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ کہ تم لوگ دنیا کے طالب ہو اور آخرت کو چھوڑتے ہو پھر فرماتے ہیں وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ بعضوں کے چہرے اس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے الخ تو "لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ" سے اوپر بھی قیامت کا ذکر ہے اور بعد کو بھی اس کا ذکر ہے اور درمیان میں یہ مضمون ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جلدی یاد کرنے کے لئے زبان بیان نہ دیا کیجئے ۔ لوگ اس مقام کے ربط میں تھک گئے ہیں اور بہت سی توجیہات بیان کی ہیں مگر سب میں تکلف ہے اور کسی نے خوب کہا ہے ۔

"کلامیکہ محتاج یعنی باشد لایعنی است"

تو جس کو حق تعالیٰ کے اس تعلق کا علم ہے جو حق تعالیٰ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اس کو آفتاب کی طرح نظر آتا ہے کہ اس کلام کا درمیان میں موقع ہے ۔ صاحبو! اس کا وہی موقع ہے جیسے وہ باپ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا کہ بری صحبت میں نہیں بیٹھا کرتے اور اس کے مفاسد بیان کر رہا تھا کہ درمیان میں بیٹے کو بڑا سا لقمہ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا ۔ یہ کیا حرکت ہے ، لقمہ بڑا نہیں لیا کرتے تو ظاہر میں لقمہ کا ذکر ترتیب کلام سے بالکل بے ربط ہے ۔ لیکن جو باپ ہوا ہوگا وہ جانے کہ نصیحت کرتے کرتے درمیان میں لقمہ کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ لڑکے نے بڑا لقمہ لیا تھا باپ نے فرط شفقت سے درمیان کلام میں اسپر بھی تنبیہ کر دی ۔

اسی طرح یہاں بھی حق تعالیٰ قیامت کا ذکر فرما رہا ہے ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس خیال سے کہ کہیں یہ آیتیں ذہن سے نہ نکل جائیں جلدی جلدی ساتھ پڑھ رہے تھے تو درمیان میں خدا تعالیٰ نے فرط شفقت سے اس کا بھی ذکر فرما دیا کہ آپ یاد کرنے کی فکر نہ کریں یہ کام ہم نے اپنے ذمہ لے

لیا ہے۔ آپ بے فکر ہو کر سنتے رہا کریں۔ قرآن آپ کے دل میں خود بخود محفوظ ہو جائے گا تو اس مضمون کو درمیان میں ذکر فرمانے کی وجہ فرط شفقت ہے اور اس کا مقتضا یہ تھا کہ اگر یہاں بالکل بھی ربط نہ ہوتا تو یہ بے ربطی ہزار ربط سے افضل تھی مگر پھر بھی باوجود اس کے ایک مستقل ربط بھی ہے اور یہ خدا کے کلام کا اعجاز ہے کہ جہاں ربط کی ضرورت نہ ہو وہاں بھی کلام میں ربط موجود ہے۔

(سبیل النجاح ص ۶ تا ۱۰)

۵۵۔ قرآن پاک کی آیتوں میں باہم ربط ہے اور مفسرین کا بیان درست ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں باوجود طرز تصنیف اختیار نہ کرنے اور شفقت کا طرز اختیار کرنے کے پھر بھی ربط کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اسلئے مفسرین کے بیان کردہ روابط مخترع نہیں ہیں اور اس ربط کو ملحوظ فرمانے کی دلیل یہ ہے کہ احادیث سے ثابت ہے کہ ترتیب نزول آیات اور ہے اور ترتیب تلاوت اور مصحف اور ہے۔ یعنی قرآن کا نزول تو واقعات کے موافق ہوا کہ ایک واقعہ پیش آیا اور اس کے متعلق ایک آیت نازل ہوگئی۔ پھر دوسرا واقعہ پیش آیا تو دوسری آیت نازل ہوگئی وعلیٰ ہٰذا تو ترتیب نزول تو حسب واقعات ہے اگر تلاوت میں بھی یہی ترتیب رہتی تو واقعی ربط کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ترتیب تلاوت خود جناب باری تعالیٰ عز اسمہ نے بدل دی یعنی حدیث میں آتا ہے کہ جب کوئی آیت کسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تو جبرئیل علیہ السلام بحکم خداوندی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہتے کہ آیت کو مثلاً سورۂ بقرہ کی فلاں آیت کے بعد رکھا جاوے اور اس کو فلاں آیت کے بعد اور اس کو فلاں سورہ کے ساتھ وعلیٰ ہٰذا۔

تو مصحف میں ترتیب آیات ترتیب نزول پر نہیں بلکہ اس کی ترتیب حق تعالیٰ نے دوسری رکھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جس آیت کو بھی کسی آیت کے ساتھ ملایا گیا ہے دونوں میں کوئی مستقل ربط اور مناسبت اور تعلق ضرور ہے۔ کیونکہ اب اگر اب بھی دونوں میں کوئی ربط نہ ہوا تو ترتیب نزول کا بدلنا مفید نہ ہوگا۔

(سبیل النجاح ص ۹)

۵۶۔ تفسیر بالرائے تحریف معنوی ہے۔

آجکل ایک شخص نے سورۂ بقرہ کی تفسیر لکھی ہے وہ مفسر اس قابل ہے کہ بقرہ ہی کی طرح ذبح کر دیا جائے۔ ظالم نے تمام عبادات کو سیاسیات پر محمول کیا ہے کہ نماز روزہ سب سیاسیات کے واسطے ہے نماز میں پریڈ کی تعلیم ہے تاکہ افسر کی اطاعت کرنا آجائے اگر وہ اٹھنے کو کہے تو اٹھو بیٹھنے کو کہے تو بیٹھو، جھکنے کو کہے تو جھک جاؤ، اسی واسطے نماز میں امام مقرر کیا جاتا ہے تاکہ سب اس کے افعال کی اطاعت واتباع کریں جس سے پریڈ کے وقت افسر کی اطاعت سہل ہوگی۔ روزہ اس واسطے مشروع ہے تاکہ جنگ میں فاقہ کا تحمل ہو سکے کیونکہ جنگ میں بعض دفعہ کھانے کو نہیں ملتا حج بھی اسی واسطے ہے تاکہ مسلمان سفر کے عادی ہوں اور گھر چھوڑنا ان پر گراں نہ رہے اور احرام بھی اس واسطے ہے تاکہ ترک زینت کی عادت ہو۔ ایک لنگی ایک چادر میں سردی گرمی کے تحمل کے عادی ہوں وغیرہ وغیرہ گویا کوئی عبادت خدا کی یاد اور عبادت و بندگی کے لئے مشروع نہیں ہوئی۔ بس ساری شریعت میں ملک گیری و سیاست کی تعلیم ہے۔ یہ اس مقولہ کا مصداق

"کلامیکہ محتاج یعنی باشد لا یعنی است"

کیونکہ نماز روزہ اور حج سے آج تک یہ مقصود کسی نے نہ سمجھا تھا یہ باتیں فرصت میں بیٹھ کر اس نے گھڑی ہیں۔ اور کھینچ تان کر نصوص کو ان پر منطبق کیا ہے جیسے بعض شعراء نے قرآن کی بعض آیتوں کو کھینچ تان کر اوزان شعر پر منطبق کیا ہے اور اس شخص نے یہ تفسیر لکھ کر گویا مخالفین اسلام کو یہ سبق پڑھایا ہے کہ وہ مسلمانوں کی نماز روزہ اور حج وزکواۃ کو بھی خطرہ کی نظر سے دیکھیں کیونکہ ان سب میں مقابلۂ اعدا کا طریقہ سکھلایا جاتا ہے۔ اور یہ نماز نہیں۔ بلکہ چاندماری ہے مگر مسلمان ہیں کہ اس تفسیر پر لٹو ہیں کیونکہ وہ چکنے کاغذ پر چھپی ہوئی ہے اور جلد بھی خوبصورت ہے۔ اور آجکل کتاب کی خوبی اس میں رہ گئی ہے کہ عمدہ چھپی ہوئی ہو ٹائیٹل خوبصورت ہو اس لئے بہت لوگ اس کو خریدتے ہیں۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے اندر کیا بھرا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک صندوق نقش ونگار سے مزین ہو اور اس کے اندر سانپ بند ہو۔ خریدنے والا اوپر کے نقش ونگار سے فریفتہ ہو کر اسے خریدتا ہے مگر جب کھولے گا اس وقت حقیقت منکشف ہوگی اور میں سچ کہتا ہوں کہ اس مصنف کا دل بھی خود جانتا ہے کہ نماز روزہ حج زکواۃ

کے جو مقاصد اس تفسیر میں لکھے ہیں وہ قرآن کا مفہوم ہرگز نہیں۔ یہ محض ایجاد بندہ ہے جس سے محض یہ مقصود ہے کہ اس تحریک کی تائید قرآن سے کی جائے جس میں یہ شخص اور اس کی ایک جماعت ایک زمانہ میں پیش پیش تھے۔ قرآن کی تفسیر ہرگز مقصود نہیں تھی بلکہ مخلوق کو دھوکہ دینے کے لئے اس کو قرآن میں ٹھونسا گیا۔ سو یاد رہے ؎

خلق را گیرم کہ بفریبی تمام　　　در غلط اندازی تا ہر خاص و عام

کارہا با خلق آری جملہ راست　　　باخدا تزویر و حیلہ کے رواست

یہ ممکن ہے کہ تم ان تاویلوں سے مخلوق کو دھوکہ میں ڈالدو۔ مگر خدا کے سامنے یہ تاویلیں نہ چلیں گی۔ اس لئے ؎

کار ہا او راست باید داشتن　　　رایت اخلاص و صدق افراشتن

تاویل وہ کرو جو خدا کے سامنے بھی بیان کرسکو۔

(ارضاء الحق حصہ دوم ص ۳۰)

۵۷ - قرآن کریم سے متعلق شبہات دور کرنیکا طریق

شبہات کا یہ علاج نہیں کہ تم اپنی رائے سے ہر شبہ کو رفع کرو بلکہ اس کا اصل علاج یہ ہے کہ شبہات کے منشار کا علاج کرو۔ ہر شبہ کو الگ الگ رفع کرنے میں دردسری بھی اور اس سے سلسلہ شبہات کا ختم نہیں ہوسکتا تم منشا کا علاج کرو انشاء اللہ سب ایک دم سے زائل ہو جائیں گے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے رات کو اندھیرے میں گھر کے اندر چوہے چھچھوندر کودتے پھرتے تھے گھر والا ایک ایک کو پکڑ کر نکالتا تھا مگر وہ پھر سب کے سب اندر آجاتے تھے۔ ایک عاقل نے کہا کہ میاں یہ سب اندھیرے کی وجہ سے کودتے پھرتے ہیں۔ تم لیمپ روشن کردو، یہ سب خود ہی بھاگ جائیں گے پھر کوئی پاس نہ پھٹکے گا۔ چنانچہ لیمپ روشن کیا گیا اور سب کے سب ادھر ادھر اپنے اپنے بل میں گھس گئے۔

اسی طرح یہاں بھی سمجھو کہ یہ وساوس شبہات جو وحی اور قرآن میں آپ کو پیش آتے ہیں ان کا منشا ظلمت قلب ہے جس کا علاج یہ ہے کہ قلب میں نور پیدا کرلو پھر ایک شبہ بھی پاس نہ آئے گا اور وہ نور کیا ہے؟ نور محبت ہے۔ حضرت! محبت و عشق وہ چیز ہے کہ جب یہ دل میں گھس جاتی ہے

تو پھر محبوب کے کسی حکم اور کسی قول و فعل میں کوئی شبہ اور کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایک پروفیسر فلسفی کسی طوائف پر عاشق ہو جاوے اور وہ اس سے یوں کہے کہ سر بازار کپڑے اتار کر ننگے آؤ تو میں تم سے بات کروں گی ورنہ نہیں تو فلسفی صاحب فوراً اس کے لئے تیار ہو جائیں گے اور یہ بھی نہ پوچھیں گے کہ بی، اس میں تیری کیا مصلحت ہے؟ اب کوئی اس سے پوچھے کہ آپ کی وہ عقل اور فلسفیت اس طوائف کے سامنے کہاں چلی گئی۔ افسوس قرآن و حدیث کے مقابلے میں تو ساری فلسفیت و عقل ختم کی جاتی ہے اور ایک ادنیٰ مردار کے احکام میں چون وچرا اور لم وکیف سب رخصت ہو گیا۔ آخر اس کی کیا وجہ؟ یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ اس کی وجہ محبت و عشق ہے۔

پس معلوم ہو گیا کہ خدا اور رسول کے احکام میں شبہات پیدا ہونے کی وجہ عدم محبت یا قلت محبت ہے اگر آپ کے دل میں نور محبت روشن ہوتا تو یہ سارے چوہے اور چھچھوندر خود بھاگ جاتے شیخ سعدیؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں ؎

ترا عشق ہمچو خودی ز آب و گل　　　رباید ہمہ صبر و آرام دل

اور جب ایک مخلوق عشق کا یہ اثر ہے تو خالق کے عشق کا اثر کیا کچھ ہونا چاہیئے ؎

عجب داری از سالکانِ طریق　　　کہ باشند در بحر معنیٰ غریق

دمادم شراب الم درکشند　　　وگر تلخ بینند دم درکشند

مولانا فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

اور میں علمار کو بھی متنبہ کرتا ہوں کہ علمار کے عرفی اخلاق ہی نے عوام کو خراب کیا ہے کہ جہاں ان کے سامنے کسی نے شبہات بیان کئے اور یہ ہر شبہ کے مفصل جواب کو تیار ہو گئے۔ ارے اصلی جواب یہ ہے کہ مرض کو تشخیص کرو اور جڑ کو اکھاڑ دو تم شاخوں چھانٹتے ہو اس سے کیا ہوگا ہے جب جڑ موجود ہے تو چند روز میں ہزاروں نئے نئے پتے اور نکل آئیں گے۔ محقق تشخیص کرکے اصل مرض کا علاج کرتا ہے اور غیر محقق آثار کا علاج کرتا ہے میں نہایت پختگی سے دعوے کیساتھ کہتا ہوں کہ جن مسلمانوں کو آجکل مذہب میں شکوک واوہام پیدا ہوتے ہیں ان کے اس مرض کا منشار قلت محبت مع اللہ ہے ان کو اللہ رسول کے ساتھ محبت نہیں ہے اور محض برائے نام تعلق کو تعلق کہا جاتا ہے۔ اور تعلق مع اللہ کے حاصل ہونے کا واحد طریق صرف یہ ہے کہ اہل اللہ کی صحبت حاصل کی جائے۔ اہل محبت کی صحبت میں یہ خاصیت ہے کہ اس سے بہت جلد محبت پیدا ہو جاتی ہے

جیسا کہ اہل غفلت کی صحبت سے غفلت جلدی پیدا ہوتی ہے پھر جب محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہوجائے گا۔ یہ لم وکیف باطل اور وساوس وشبہات سب جاتے رہیں گے ۔

میں علماء سے خیر خواہی کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم ان شبہات کے جواب میں کیوں اپنا دماغ تھکاتے ہو۔ بس تم صرف ایک کام کرو کہ ان لوگوں کو اہل اللہ کی صحبت ومحبت کا پتہ دو ۔

(غایۃ النجاح ص۵)

۵۸ - وجود صانع کی عقلی دلیل -

فلسفی طریقہ پر وجود صانع کی دلیل یہ ہے کہ تمام عالم حادث ہے ۔ کیونکہ بہت سی چیزوں کا حدوث تو ہم کو مشاہد ہے اور جن کا حدوث مشاہد نہیں ہوا ان کے احوال کا تغیر وانقلاب بتلا رہا ہے کہ یہ حادث ہیں ۔ کیونکہ محل حادث کا حادث ہوتا ہے ۔

ابھی میں نے اخبار میں ایک امریکن ڈاکٹر ماہر سائنس کا قول پڑھا ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ آفتاب کی روشنی میں بہت کمی آگئی ہے اور عنقریب اس کی روشنی زائل ہوکر یہ چراغ گل ہوجائے گا اور اس وقت دنیا میں اس قدر سردی پڑے گی کہ مخلوق کا زندہ رہنا محال رہے گا تمام عالم فنا ہوجائے گا۔ (ہم اس خبر سے خوش ہوئے کہ اہل سائنس کو قرآن سے قیامت کی خبر کا یقین نہ ہوا تھا تو اب آلات رصد سے یقین آنے لگا) ۔

غرض اشیاء عالم کا تغیر وانقلاب پتہ دے رہا ہے کہ یہ سب حادث ہیں ۔ قدیم نہیں ۔ یعنی ان کا وجود دائمی اور ضروری نہیں ۔ اور حادث کے لئے ممکن ہونا لازم ہے اور ممکن کے لئے کسی مرجح کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ ممکن وہ ہے جس کا وجود و عدم مساوی ہو ۔ یعنی نہ اس کے لئے موجود ہونا ضروری ہے نہ معدوم ہونا ضروری ہے اور جس کا وجود ، عدم وجود برابر ہو تو اس کے وجود کے لئے کوئی مرجح ہونا چاہیئے ۔ ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور ترجیح بلا مرجح باطل ہے ۔

پھر اس مرجح میں گفتگو کی جائے گی کہ وہ ممکن ہے یا کچھ اور ہے اگر مرجح ممکن ہو تو اس کے لئے دوسرے مرجح کی ضرورت ہوگی اور چونکہ تسلسل محال ہے اس لئے کہیں نہ کہیں سلسلہ ختم کرنا پڑے گا ۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ مرجح ایسی ذات ہے جو ممکن نہیں بلکہ واجب الوجود ہے اسی واجب الوجود کو ہم صانع اور خلاق عالم کہتے ہیں اس ایک سوال یہ ہوگا کہ صانع کے ماننے کے بعد بھی ترجیح

بلا مرجح لازم آتی ہے کیونکہ صانع نے تمام مخلوقات کو ایک دم سے پیدا نہیں کیا ۔ کسی کو آج سے ہزار برس پہلے سو برس پہلے پیدا کیا ۔ اور کسی کو بعد میں پیدا کرے گا اور کسی کو حسین بنایا کسی کو بدشکل ۔ کسی کو مرد کسی کو عورت ۔ کسی کو امیر کسی کو غریب ، کسی کو عاقل کسی کو احمق ۔ تو یہاں مرجح کون ہے ؟ زید کو آج کیوں پیدا کیا ۔ کل کیوں نہیں کیا تھا ؟ اور اس کو امیر کیوں بنایا عمرو کی طرح غریب کیوں نہ بنایا ۔ زید کو عمرو پر کیا ترجیح تھی ؟ مثلاً اس سوال کا جواب حکمائے اسلام کے سوا کوئی نہ دے سکا ۔ فلاسفہ کی عقلیں یہاں آکر چکر کھانے لگیں ۔ حکمائے اسلام نے اس کا جواب دیا ہے کہ ان امور میں ارادۂ واجب مرجح ہے اور ارادہ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے مرجح ہے اس کے لئے کسی دوسرے مرجح کی ضرورت نہیں ۔ اس پر حکمائے یونان کی طرف سے ان کے معتقدوں نے یہ اشکال وارد کیا ہے کہ بیشک یہ تو ہم نے مان لیا ہے کہ ارادہ کے لئے کسی مرجح کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی ذات سے مرجح ہے ۔ مگر یقیناً خدا تعالیٰ کا ارادہ قدیم ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ارادہ تو قدیم اور مراد حادث ہو ۔ اس صورت میں تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آتا ہے اور یہ محال ہے ۔

ایک اعتراض کا جواب

اس کا جواب حکمائے اسلام نے ایسا دیا ہے کہ حکمائے یونان کے دانت کھٹے ہوگئے ۔ فرمایا کہ صفات واجب اپنی ذات میں قدیم ہیں مگر ان کا تعلق ممکنات کے حادث ہے اور تخلف مراد کا تعلق ارادہ کے بعد محال ہے اس سے پہلے محال نہیں ۔ پس ہم یہی کہیں گے کہ ارادہ کا تعلق مختلف طور سے ہوتا ہے ۔ اس لئے مراد کا وجود بھی مختلف ازمنہ اور مختلف حالات کے ساتھ ہوتا ہے ۔

یہ عقلی دلیل ہے وجود صانع کی ۔ (غایت النجاح ص۲۰، ۲۱)

۵۹ - عہد میثاق پر شبہ کا جواب -

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اس عہد کی کیفیت بیشک یاد نہیں رہی لیکن اس کا مقصود سب کو یاد ہے اور مطلوب مقصود ہی کا یاد ہونا ہے ۔ کیفیت تعلیم وتعلم کا یاد رہنا ضروری نہیں ۔ دیکھو جن لوگوں نے کبھی فارسی پڑھی ہے ان کو یہ محفوظ ہے کہ آمدن کے معنیٰ آنا ،، میں کیونکہ آمدنی کا سبق آج کل ہر شخص کو یاد ہے لیکن آپ ان سے یہ پوچھیں کہ آمدن کے معنیٰ آپ کو کس دن اور کس جگہ پڑھائے گئے اور آمد نامہ آپ نے کون سے استاد سے پڑھا ہے ۔ تو ان سوالات کا جواب

شاید ہزار میں ایک ہی آدمی دے سکے گا۔ کیونکہ باتیں کسی کو محفوظ نہیں رہتیں تو کیا ان کے نہ یاد رہنے سے یہ کہا جائے گا کہ آمد نامہ پڑھنا فضول اور بیکار کیا۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر شخص یہ کہے گا کہ آمد نامہ پڑھنے سے صرف مقصود یہ تھا کہ اس کا مضمون یاد رہے۔ کیفیت تعلیم وتعلم کا یاد رہنا مقصود نہ تھا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ میثاق الست سے مقصود یہ تھا کہ وجود صانع اور توحید صانع کا مضمون طبائع میں مرکوز ہوجائے کیفیت تعلیم کا محفوظ ہونا مقصود نہ تھا۔ سو بحمداللہ وجود اور توحید صانع فطرةً ہر شخص کے دل میں مرکوز ہے اسی کا یہ اثر ہے کہ مصنوعات کو دیکھ کر ایک جاہل بدوی بھی صانع کے وجود پر استدلال کرتا ہے۔

اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آمد نامہ کی جو تم نے مثال دی ہے تو وہاں ہزار میں ایک آدمی تو ایسا نکلتا ہے جس کو کیفیت تعلیم بھی یاد ہوتی ہے چنانچہ بعضے قوی الحافظ اب بھی بتلا سکتے ہیں کہ ہم نے آمد نامہ کس سے پڑھا تھا اور کس مکان میں پڑھایا تھا۔ مگر میثاق الست کی کیفیت یاد رکھنے والا تو کسی ہزار میں بھی ایک نہیں ملتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے یہاں بھی بعضے قوی الحافظ ایسے موجود ہیں جن کو اس عہد کی کیفیت اب تک یاد ہے۔ چنانچہ شیخ سعدی اس طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں ؎

الست از ازل ہمچناں شاں بگوش

بفریاد قالوا بلیٰ در خروش۔

اس میں تو اجمالاً بتلایا گیا ہے کہ اس عہد کے یاد رکھنے والے اب موجود ہیں۔ اور بعض بزرگوں کے کلام میں اس سے زیادہ تفصیل موجود ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہم کو یاد ہے کہ اس وقت ہماری دائیں طرف اور بائیں طرف فلاں تھا۔ اور انھیں بزرگوں کے کشف سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس وقت صف بستہ نہ تھیں۔ بلکہ یوں ہی گڈ مڈ جمع تھیں جیسے میلہ میں اجتماع ہوا کرتا ہے پھر اس وقت جو لوگ باہم رو در رو ہوگئے ان میں تو طرفین سے محبت ہوتی ہے اور جو لوگ رو در پشت ہوئے کہ ایک کا منہ دوسرے کی پشت طرف تھا ان میں ایک طرف سے محبت اور ایک طرف سے اعراض ہوتا ہے اور جو پشت در پشت ہوئے ان میں طرفین سے انقباض و اعراض ہوتا ہے۔ اور ان بزرگ کے مذاق پر اس حدیث کا یہی محمل ہے الارواح جنود مجندة فما تعرف منها ائتلف وما تناکر منہا اختلف ایک اور بزرگ ارشاد ہے کہ جس وقت ازل میں میثاق لیا گیا تو سب ارواح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منہ تکنے لگیں جو آپ کہیں گے وہی سب کہیں گے چنانچہ سب سے پہلے حضور اقدس وسردار دو عالم (فداہ آبائنا وامہاتنا) کی زبان مبارک سے۔ بلیٰ نکلا تو آپ کے

بعد سب نے بلیٰ کہا (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ کما یحب ویرضیٰ) تو حضرات! آپ کو سب کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے۔ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں جو جنت اور دوزخ کی پیمائش تک کر آئے ہیں کہ جنت کتنی بڑی ہے اس کے کتنے درجے ہیں۔ اسی طرح دوزخ کی تفصیل سیر کی اور پیمائش بھی کر لی۔ اور یہ سیر روحانی طریقہ پر تھی۔ (غایۃ النجاح ص۱۸ تا ۲۰)

۶۰- مال تدبیر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ تقدیر سے حاصل ہوتا ہے

اگر کوئی یہ سمجھے کہ یہ تو میری تدبیر وسلیقہ سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ قارون نے کہا تھا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان تدبیروں کو راست کس نے کیا کیونکہ بہت لوگ تم سے زیادہ تدبیریں کرتے ہیں مگر ان کو خاک بھی نہیں ملتا۔ دو طالب علم بی، اے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بعض دفعہ اساتذہ اور سب طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں زید زیادہ لائق ہے اور وہ نمبر اول میں پاس ہوتا ہے مگر نتیجہ امتحان اس کے خلاف ظاہر ہوتا ہے کہ زید فیل ہوجاتا ہے اور عمرو جو اس سے کم درجہ میں ہے پاس ہوجاتا ہے۔ بتلایئے عمرو کی تدبیر کو کس نے راست کیا اور زید کو کس نے ناکام کیا اگر تدبیر ہی مدار تھا تو زید کو نمبر اول ہونا چاہیئے تھا مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے اسی طرح دو شخص تجارت کرتے ہیں جن میں ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے۔ دوسرا بےوقوف جاہل ہے تدبیر کا مقتضا یہ تھا کہ تعلیم یافتہ کی تجارت بیوقوف سے زیادہ چلتی مگر مشاہدہ بارہا اس کے خلاف ہوتا ہے کہ جاہل کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور ہوشیار تعلیم یافتہ کو نقصان بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ غور کریں گے تو زراعت اور ملازمت وغیرہ تمام امور میں ایسی صدہا نظائر دیکھیں گے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محض تدبیر کافی نہیں بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ تدبیر راست بھی ہوجائے اور یہ بات سوائے خدا کے کسی کے قبضہ میں نہیں ورنہ اپنی تدابیر کا راست ہونا کون نہیں چاہتا۔ پھر سب کے سب مقصود میں کامیاب ہی ہو اکرتے ناکام کوئی نہ رہتا۔ حالانکہ مشاہدہ یہ ہے کہ سو تدبیر کرنے والوں میں بیس تیس کامیاب ہوتے ہیں اور زیادہ ناکام ہوتے ہیں اب اگر یہ کامیاب ہونے والے اپنی کامیابی کو تدبیر کا ثمرہ سمجھیں تو یہ محض ان کی حماقت ہے۔ ان کو سوچنا چاہیے کہ

تدبیر تو وہ لوگ بھی کر رہے تھے جو ناکام ہوئے پھر اس کی کیا وجہ کہ وہ ناکام ہوئے اور ہم کامیاب ہوگئے یہ سب گفتگو ان لوگوں کے واسطے ہے جو سائنس کے معتقد ہیں ورنہ مسلمان تو سب کے سب یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ محض تدبیر موثر نہیں بلکہ تدبیر کے راست ہونے کے لئے تقدیر کی موافقت بھی شرط ہے اور تقدیر مشیت الٰہیہ کا نام ہے۔

اہل سائنس کی ایجاد

اہل سائنس ناز کرتے ہیں کہ ہم نے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کی ہیں جن کی پہلے لوگوں کو خبر بھی نہ تھی میں کہتا ہوں اگر حقیقت میں تم ہی موجد ہو تو بتلاؤ کہ جس ایجاد کو تم نے ایک سال کے غور و فکر کے بعد ظاہر کیا ہے اس میں ایک سال کیوں لگا اگر تمہارے قبضے میں سب کام تھا تو ایک ہی دن میں ایجاد کر لی ہوتی اور یہی ایک کیا بلکہ جو چیز ایجاد کرنا چاہو ایک دن بلکہ ایک ساعت بلکہ ایک منٹ میں ایجاد کر لیا کرو۔ کیونکہ سب کام تمہارے لئے ہیں ہی پھر دیر کی کیا وجہ؟ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کے قبضے میں نہیں کہ جب چاہے جو کچھ چاہے ایجاد کر لے مگر زمانہ دراز تک غور و فکر کرنے کے بعد ایجاد سمجھ میں آتی ہے، اب بتلاؤ جس وقت بات سمجھ میں آئی ہے وہ تمہارے اختیار سے سمجھ میں آئی یا بلا اختیار خود بخود دل میں آ گئی؟ اگر کہو اختیار سے سمجھ میں آئی تو اختیار تو ایک سال پہلے بھی موجود تھا اس وقت کیوں نہ سمجھ لیا۔ یقیناً کہو گے کہ دفعۃً بلا اختیار سمجھ میں آئی ہے۔ بس یہی تقدیر ہے اور حق تعالیٰ ہی کے سمجھانے سے تمہارے ذہن میں یہ ایجاد آئی ہے کیونکہ ان کی عادت ہے کہ جب انسان کسی کام کے لئے کوشش کرتا ہے اور اپنی سی کوشش صرف کر دیتا ہے تو وہ امداد فرماتے ہیں۔

بہر حال یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے مال و متاع کو اپنی تدابیر کا نتیجہ اور عقل کا ثمرہ سمجھے۔ ہر شخص کو عاجز و لاچار ہو کر ماننا پڑے گا کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ دوسرے کا دیا ہوا ہے یعنی حق تعالیٰ کا۔ اب فرمائیے اگر آپ خدا کا دیا ہوا مال اللہ کے راستے میں تھوڑا سا صرف کر دیں اور اس کے بعد آپ کو ثواب اور نعمت عظمیٰ عطا کی جائے تو یہ نعمت مفت ملی یا نہیں؟ یقیناً مفت ملی۔

(مظاہر الاموال ص۱۳)

۶۱۔ اسلام نے سادگی سکھلائی ہے !!!

غیر قوموں کے طریقہ پر چلنے کی تم کو کچھ ضرورت نہیں۔ بلکہ اسی سادگی کے طریقہ پر چلو جو اسلام نے ہم کو سکھلایا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس شام سے لشکر اسلام نے ایک عرضداشت بھیجی تھی کہ بیت المقدس فتح نہیں ہوتا۔ اور وہاں کا پادری یہ کہتا ہے کہ فاتح بیت المقدس کا حلیہ ہماری کتاب میں موجود ہے۔ تم اپنے خلیفہ کو بلا لو ہم دیکھیں گے اگر ان کا حلیہ ہو گا جو اس کتاب میں ہے تو ہم بدون لڑائی کے قلعہ کھول دیں گے ورنہ تم قیامت تک فتح نہیں کر سکتے۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ امیر المؤمنین یہاں تشریف لے آئیں شاید یہ قلعہ بدون لڑائی کے فتح ہو جائے۔ امیر المؤمنین رضؓ نے اس درخواست پر سفر کا ارادہ فرمایا اب غور فرمائیے کہ ایک شخص کا دورہ تھا جس کے نام سے کسریٰ اور ہرقل بھی تھراتے تھے۔ مگر حالت یہ تھی کہ جس قمیص میں آپ نے سفر کیا تھا اس میں چند در چند پیوند تھے اور سواری کے لئے صرف ایک اونٹ تھا اس سے زیادہ کچھ نہ تھا جس پر کبھی آپ سوار ہوتے کبھی آپ کا غلام۔ آج کل ادنیٰ سے ادنیٰ ڈپٹی کے دورے پر بڑا سامان ہوتا ہے۔ یہاں خلیفہ اعظم کے دورے میں کچھ بھی سامان نہ تھا۔ پھر آج کل ادنیٰ حاکم کے دورے میں رعایا پریشان ہو جاتی ہے کیونکہ رعایا کو ان کے دورہ کیلئے رسد کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ یہاں خلیفہ کے دورہ سے ایک متنفس کو بھی تکلیف نہ ہوئی۔ کیونکہ ہر شخص کے ساتھ ایک تھیلے میں ستو اور ایک تھیلے میں چھوہارے بندھے ہوئے تھے منزل پر اتر کر ستو گھول کر پی لیا کر و چھوہارے کھا لئے۔ نہ رعایا سے مرغ لئے نہ انڈے نہ دودھ لیا نہ گھی۔ جب اس شان سے کبھی سوار کبھی پیدل چلتے ہوئے شام کے قریب پہونچے تو لشکر اسلام نے استقبال کرنا چاہا۔ آپ نے ممانعت کر دی۔ خاص خاص حضرات نے آپ کا استقبال کیا۔ اس وقت بعض صحابہ نے کہا کہ امیر المومنین اس وقت آپ دشمن کے ملک میں ہیں اور وہ لوگ آپ کو دیکھیں گے اسلئے مناسب ہے کہ اپنا یہ قمیص اتار کر دوسرا قمیص عمدہ سا پہن لیجئے اور اونٹ کی سواری چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہو جائیے تا کہ ان کی نظر میں عزت ہو۔ حضرت عمر رضؓ نے فرمایا نحن قوم اعزنا اللہ بالاسلام ہم وہ لوگ ہیں جن کو خدا نے اسلام سے عزت دی ہے ہماری عزت قیمتی لباس سے نہیں ہے۔ بلکہ خدا کی اطاعت سے عزت ہے مگر صحابہ رضؓ کے اصرار سے ان کا دل خوش کرنے کے لئے دو ایک بار

منظور کرلی چنانچہ ایک عمدہ قمیص لایا گیا جس کو پہن کر آپ گھوڑے پر سوار ہوئے دو چار ہی قدم چلے تھے کہ فوراً گھوڑے سے اتر پڑے اور فرمایا۔ میرے دوستو! تم اپنے بھائی عمر کو ہلاک ہی کرنا چاہا تھا واللہ میں دیکھتا ہوں کہ اس لباس اور اس سواری سے میرا دل بگڑنے لگا ہے تم میرا دہی پیوند لگا قمیص اور اونٹ لے آؤ میں اسی لباس میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر چلوں گا۔

اے صاحبو! جب ایسے شخص کا دل قیمتی لباس سے بگڑ رہا ہے تو ہمارا دل اور ہمارا منہ نہ بگڑیگا۔ پھر ہم اپنے قلب کی نگہداشت سے اتنے غافل کیوں ہیں۔ اور ہم کو کس چیز نے مطمئن کر دیا ہے کہ ہمارے لئے کوئی لباس مضر نہیں۔ اور جو حضرت عمر نے فرمایا تھا۔ نحن قوم الخ واقعی بات یہی ہے کہ اگر ہم خدا کے مطیع و فرمانبردار ہیں تو ہم سادہ لباس میں بھی معزز ہیں ورنہ قیمتی لباس سے بھی کچھ عزت نہیں ہو سکتی ؎

ز عشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است!

باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

خوبصورت چہرہ کو زیب و زینت کی ضرورت نہیں وہ تو ہر لباس میں حسین ہے۔ بناوٹ کی احتیاج اس کو ہے جس کو قدرتی حسن نصیب نہ ہو۔ چنانچہ حضرت عمر اپنا وہی لباس پہن کر چلے اور اونٹ ہی پر سوار ہوئے اور اسی لباس اور سواری پر آپ کو دیکھ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ کیونکہ جب آپ فصیل شہر کے قریب پہنچے اور نصاریٰ کو اطلاع ہوئی کہ خلیفۂ اسلام تشریف لے آئے تو ان کا بڑا پادری فصیل پر آیا اور کتاب کھولی کہ حضرت عمر رضہ کے حلیہ کو ان اوصاف میں ملانے لگا جو کتاب میں لکھے ہوئے تھے اس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ حضرت عمر رضہ ایسے لباس اور ایسی سواری پر تشریف لاویں گے اس معمولی لباس ہی میں آپ کی عزت مخفی تھی ؎

ع کہ آب چشمۂ حیوان درون تاریکی است

اگر آپ قیمتی لباس میں آتے تو پیشین گوئی پوری نہ ہوتی۔ چنانچہ پادری نے جب سارے اوصاف کتاب کے موافق دیکھ لئے تو وہ چیخ مار کر گر پڑا اور کہا کہ جلدی سے قلعہ کا دروازہ کھول دو۔ (بخدا یہی وہ شخص ہے جس کا لقب توراۃ میں حدید ہے) یہی فاتح بیت المقدس ہے تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے بدون جنگ و جدال کے بیت المقدس کو فتح کر دیا۔

مولانا گنج مرادآبادیؒ

تو صاحبو! ہمیں تکلیف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔ ہماری عزت تو سادگی ہی میں ہے۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی اسی زمانہ میں ایک بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ سے لفٹنٹ گورنر نے ملنے کی اجازت

چاہی۔ یہاں سے اجازت ہوگئی۔ اس وقت تو آپ یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ لفٹنٹ گورنر کے واسطے سونے کی کرسی ہم کہاں سے لائیں گے۔ خدام نے عرض کیا کہ اس کی حاجت نہیں وہ چوبی کرسی پر بیٹھ سکتے ہیں چونکہ لفٹنٹ گورنر اس وقت مہمان ہو کر آرہے تھے اور مہمان کی مدارت اس کے مذاق کے موافق ہوتی ہے اسلئے یہ خیال ہوا مگر یہ سارے منصوبے پہلے ہی پہلے تھے۔ وقت پر کچھ بھی اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ آپ کو یہ بھی یاد رہا کہ لفٹنٹ گورنر کس دن آئیں گے چنانچہ جب دن آیا اور لفٹنٹ گورنر حضرت کی خانقاہ میں پہونچے تو وہاں کوئی تکلف نہ تھا۔ سب معمولی سامان تھا۔ بعد ملاقات لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ حضرت ہمیں کچھ نصیحت و وصیت فرمائیں۔ ارشاد فرمایا ظلم کبھی نہ کرنا۔ پھر اس نے درخواست کی کہ ہم کو کچھ تبرک عطا فرما دیا جاوے۔ فرمایا میرے پاس کیا رکھا ہے۔ پھر خادم سے فرمایا کہ ارے دیکھنا، مٹھائی کی ہنڈیا میں۔ کچھ ہو تو ان کو دے دو۔ یہ مانگ رہے ہیں چنانچہ ہنڈیا میں سے مٹھائی کا چورا تھوڑا تھوڑا سب کو دے دیا گیا جس کو سب نے نہایت ادب سے لیا اور بڑے خوش خوش واپس ہوئے۔

تو دیکھئے مولانا کو اول تو اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ تکلف کا خیال ہوا بھی تھا۔ مگر آخر میں یہ سارے منصوبہ مٹ گئے۔ اور وہی اسلامی سادگی رہ گئی اور اسی میں ان کی عظمت و عزت ظاہر ہوئی ؎

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی!! بگڑنے میں بھی زلف ان کی بنا کی

بے تکلفی

غرض ہم کو اسلامی سادگی پر رہنا چاہیئے اگر کسی مسلمان کی خاطر سے کچھ تکلف بھی کیا جائے تو اس میں بھی اعتدال اسلامی کا لحاظ ضروری ہے۔ مبالغہ نہ کیا جائے اس میں ہماری عزت ہے۔ مگر آج کل مسلمان تقلید یورپ میں اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ ان کا لباس اور ان کا طرز معاشرت ان کا طریقہ تمدن و تجارت اختیار کر کے ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس میں مسلمان کی عزت نہیں۔

ایک واقعہ

ایک بار میں بریلی میں تھا۔ بھائی سے ایجنٹ نے کہا کہ ہم آپ کے بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھائی نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ ہم خود تو حکام سے نہیں ملتے لیکن جب وہ خود ملنا چاہتے ہیں تو اعراض کرنا برا ہے۔ آخر وہ حاکم ہیں۔ ہم کو حق حکومت کا لحاظ ضروری ہے میں چلوں گا۔ بھائی نے میرے واسطے قیمتی لباس کا اہتمام کرنا چاہا میں نے کہا ہرگز نہیں۔ جس لباس میں میں یہاں آیا ہوں۔ اسی میں جاؤں گا۔ چنانچہ میں اچکن اور کرتہ میں

ان سے ملنے گیا وہ شاید غسل کر رہے تھے۔ ہم کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے عصر کی نماز کا وقت آگیا۔ اور میں نے اور بھائی نے ان کے بنگلہ ہی میں نماز پڑھی۔ پھر وہ آکر ملے اور مجھ کو اپنی خاص کرسی پر بیٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے اصرار بھی کیا مگر نہیں مانے۔ پھر نہایت احترام کے ساتھ باتیں کیں۔ اور تھوڑی دیر میں رخصت ہو کر آگئے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں انگریزی لباس میں ملتا تو وہ عزت ہرگز نہ ہوتی جو اسلامی لباس میں ہوئی۔

کلکتہ میں مولوی عبدالجبار صاحب وائسرائے سے عبا اور چوغہ پہن کر اور عمامہ باندھ کر ملے دوسرے روساء انگریزی لباس میں گئے تھے تو وائسرائے نے ان سے کہا کہ مولوی صاحب آپ اس لباس میں شہزادے معلوم ہوتے ہیں یہ لباس بڑی راحت کا ہے۔ اور ہمارا لباس بہت تکلیف دہ ہے مگر ہم اپنی قومی وضع سے مجبور ہیں ہم کو آپ کے لباس پر بہت رشک آتا ہے۔

غرض ہم کو جو شریعت نے تعلیم دی ہے اس پر چلنا چاہیئے۔

(مطاھر الاموال ص۲۲)

۶۲ - علماء پر ایک اعتراض کا جواب

مجھے اس وقت اس سے تو بحث نہیں کہ مسلمانوں کی ترقی ... انگریزی پڑھنے پر موقوف ہے یا نہیں۔ فرض کر لیجئے کہ اسپر موقوف ہے اور بدون اس کے مسلمانوں کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے انگریزی نہ پڑھنے کا الزام آیا علماء پر لگانا صحیح ہے یا غلط؟ سو پوچھتا ہوں کہ کیا علماء صرف انگریزی ہی سے منع کرتے ہیں۔ یا علم دین حاصل کرنے کا حکم بھی دیتے ہیں۔ اور بتلائیے کسی اور بات سے بھی منع کرتے ہیں؟ یقیناً وہ بہت سی باتوں سے منع کرتے ہیں مثلاً جھوٹ بولنے سے غیبت کرنے اور کسی کا حق دبانے سے اگر مسلمان انگریزی علماء کے منع کرنے سے نہیں پڑھتے تو ان کے کہنے سے علم دین کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر یہ مولویوں کا اثر ہوتا تو دوسری باتوں میں بھی تو ہوتا صرف اسی ایک بات میں اثر کیوں ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے میں دوسری قوموں سے اپنی سستی کی وجہ سے پیچھے ہیں کہ ان سے محنت نہیں ہوتی۔ یا افلاس کی وجہ سے کہ ان کے پاس انگریزی تعلیم کے مصارف کے لئے رقم نہیں

علماء کے منع کرنے سے کوئی رکتا۔ الا ماشاء اللہ وہو نادر والنادر کالمعدوم۔ مگر آج کل تو الزام ملنے میں علماء کی وہی حالت ہے جیسے ایک بھٹیاری کی حکایت ہے گو حکایت تو فحش ہے مگر مولانا نے اس سے بھی زیادہ فحش حکایتیں مثنوی میں لکھی ہیں اور ان سے علوم نکالتے ہیں اس لئے بیان کرتا ہوں۔

ایک بھٹیاری کا قصہ

قصہ یہ ہے کہ ایک سپاہی سرائے میں ٹھیرا اور بھٹیاری کو کھانا پکانے کیلئے جنس دی۔ بھٹیاریاں اکثر جنس چرایاں کرتی ہیں اس لئے سپاہی اس کے پاس مسلط ہو کر بیٹھ گیا اس نے بہت کوشش کی کہ آنکھ بچا کر چراؤں مگر سپاہی نے موقع ہی نہ دیا۔ اب اس نے یہ تدبیر کی کہ جب سپاہی کھانا کھانے بیٹھا تو ساتھ میں اپنے لڑکے کو بھی بٹھا دیا کہ تو بھی کھالے۔ شریف آدمی کا دسترخوان پر سے کسی کو اٹھانا گوارا نہیں ہوتا۔ اس لئے سپاہی خاموش ہو گیا۔ اتفاق سے بھٹیاری کی ریح زور سے صادر ہو گئی۔ اس کے خفت اتارنے کو اپنے بچے کے ایک دھپ لگایا کہ دور موئے کھانا کھاتے ہوئے کیا کرتا ہے۔ سپاہی کو انتقام کا موقع ملا۔ اس نے قصداً ریح صادر کی اور زور سے ایک چپت لڑکے کو رسید کیا اور کہا یاد رکھ کرے گا کوئی مگر پٹے گا تو ہی۔ اس سے بھٹیاری کو بھی بتلا دیا کہ تیری حرکت کو میں سمجھ گیا ہوں بس یہی حال آج کل کے مسلمانوں نے علماء کا کر رکھا ہے کہ کرے کوئی مگر الزام انھیں پر ہوگا۔ انگریزی نہ پڑھنے کا الزام بھی مولویوں پر اور مسلمانوں کے تنزل و افلاس الزام بھی علماء پر اور جاہل اور مرتد ہونے کا الزام بھی ان ہی پر۔ مسلمانوں کی نا اتفاقی کا الزام بھی انھیں پر۔

(اصلاح ذات البین ص۱۶)

۶۳ - اس اعتراض کا جواب کہ شریعت قید محض ہے

ہمارے ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں۔ اور شریعت کو قید بتلاتے ہیں۔ ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں۔

ایک صاحب کانپور میں کوٹ، پتلون، بوٹ، سوٹ سے کسے کسائے میرے پاس آئے۔ وہ بیٹھنا چاہتے تھے۔ کرسی پر وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں کے پاس کرسی کہاں۔ ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فخر ہے۔ اب وہ کھڑے ہیں۔ لیکن کھڑے

کھڑے بات کیسے کریں ۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی ۔ چھڑی پر سہارا دے کر اور تاک لگا کر بھد سے گر پڑے ۔ مجھے بڑی ہنسی آئی ۔ بتلائیے کہ تہذیب ہے یا تعذیب ۔ یہ آزادی ہے یا قید ہے ۔ بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی اٹھنا اور بھی زیادہ مصیبت ہوا ۔ اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے رہتے ہوں گے ۔ اور لیجئے اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجاوے تو ہم دانے بھی چبا سکتے ہیں ۔ اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں ۔ اور ان کے لئے میز کرسی ہو کانٹا ہو ۔ چھری ہو ۔ جب یہ کھانا تناول فرمائیں ۔ کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہے کہ پاجامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے ۔ اچکن نہ ہو کرتہ کافی ہے عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی ۔ پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو ۔ پھر حدود شرعیہ کی بھی قید نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو ۔ لٹھے کا ہو گاڑھے کا ہو ۔ گزی کا ہو ، کسی شئے کا ہو ۔ نہ ہو لنگی بھی کفایت کرتی ہے ۔ ان کو یہ مصیبت ہے کہ پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو ، تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو ۔ قمیص بھی اس کے مناسب ہو ۔ ورنہ فیشن کے خلاف ہے ۔ کیوں صاحبو ! یہ آزادی تو بڑی بھاری قید ہے ۔ میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا اور رسول سے آزاد ہیں ۔ باقی نہ کھانے میں آزاد ہیں نہ پہننے میں آزاد ۔ ہر بات میں مقید ہیں ۔ اگر آزاد ہیں تو خدا اور رسول سے آزاد ہیں ۔ تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی اور مبارک رہے ہم کو یہ قید ۔ اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو یہ حالت ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند | شکارش نخواہد خلاص از کمند

اور یہ وہ قید ہے ؎

گر دو صد زنجیر آری ۔ | غیر زلف آں نگار مقبلم ۔

اور ہماری ایسی قید ہے کہ مدتوں کے بعد محبوب کسی کو ملا ہو اور اپنے لطف و کرم سے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ کر عاشق کو اپنے پاس بٹھلائے اور اس کو نہ چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی تو غیبت میں یہ حالت تھی کہ کہا کرتا تھا ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دست من بار دگر جاناں من گیرد

بھلا اب کیا حال ہوگا ۔ بلکہ اگر محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے میں تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا جان بھی نہ چھوڑ ۔ اور کہے گا ؎

؎ نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی ۔

پس جن کو خدا اور رسول کے ساتھ اس درجہ محبت ہے ۔ کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھیں گے ہرگز نہیں ۔ جس کسی کو محبت ہوئی ہوگی ۔ وہی اس کا لطف جانتا ہے ۔ ہاں جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو ۔ وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے ۔ نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے ۔ ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں ۔ وہ چولھے میں ڈالے گا ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا ایسی عقل کو اور سر پر رکھے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم | مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو ، ناداری ہو بیماری ہو افلاس ہو اس کو سب گوارہ ہیں ۔ اور اول تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی ۔ اور بالفرض اگر ہو بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہے ۔ اس کی زندگی لطف کی زندگی ہے خواہ کسی حالت میں ہو حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں ۔ من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ ۔ یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت ، اس کو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں ۔ ان کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے ۔ ان کے قلب میں سکون اور چین کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے ؎

سوئے نومیدی مرو کامیدہاست | سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں ۔ اور ایسی قید کے مقابلے میں جو آزادی ہے وہ نری مہمل ہے اور سراسر خسران ہے ۔ خرمان ہے ۔ اور یہ آزادی بس خدا اور رسول سے آزادی ہے ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں ۔

(الاتفاق صنہ ۲)

۶۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی پر شبہات کا جواب

ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ ہیں کہ اس سے افلاک میں خرق والتیام لازم آتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق والتیام کے امتناع پر کوئی دلیل نہیں۔ اور جب وہ دلائل پیش کریں گے اس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا لغو ہونا ثابت کر دیں گے چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلد سیر سماوات سے فارغ ہو کر واپس آ گئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتویں آسمان تک آپ سیر کر آئیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے سے حصہ میں ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ کی کیا بات ہے ہاں استبعاد ہو سکتا ہے سو وہ بھی بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے۔ چنانچہ رات دن کا آنا، طلوع و غروب کا ہونا، یہ سب حرکت فلک سے مرتبط ہے۔ اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہوگا وہی رہے گا اگر رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی، دن موجود ہوگا تو دن ہی رہے گا۔ تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں۔ معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔

معراج کا واقعہ ہم جب حیدر آباد گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی سڑک پر لوگوں کو چلنے سے روک رہے ہیں اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا تھا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے۔ پس آفتاب جس جگہ تھا اسی جگہ رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اس میں کیا استبعاد

ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے۔ پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی۔ تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے مشروع ہوئی۔ تو آپ کی سیر میں چاہیے کتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا۔ کیونکہ حرکت اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے لزوم کو ثابت کرے انشاء اللہ ایک بھی دلیل قائم نہ کر سکے گا

دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامیؒ نے دیا ہے ؎

تن او کہ صافی تر از جانِ ماست ۔۔۔ اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خیال انسانی ذرا سی دیر میں بہت دور پہونچ جاتا ہے چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہونچ جائے گا خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے اور روح نہایت لطیف چیز ہے، وہ مادیت کی طرح کثیف نہیں ہے اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب و مانع نہیں ہوئے تو مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذرا سی دیر میں کہیں سے کہیں پہونچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذرا سی دیر میں ہو آئے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ایک دلیل عقلی فلاسفہ جدید پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلا ہے اس میں ہوا نہ ہونے کے سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ اگر اس میں سے گذرتے زندہ کیسے رہتے۔ مگر انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس التزام کے۔ یہ اس وقت ہے جب متنفس کو اس کچھ مکث بھی چنانچہ آگ کے اندر اگر جلدی جلدی ہاتھ نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت سرعت اس خلا میں سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں مؤثر نہ ہوگا۔

اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول ہے۔ وَاللّٰہِ مَا فُقِدَ جَسَدُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ لَیْلَۃِ الْاِسْرَاءِ کہ بخدا شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے تو یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں کہاں تھیں (نیز اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی۔ شاید چار پانچ سال کی ہوں۔ اور اگر معراج ۵ھ نبوی میں ہوئی جیسا کہ

زہری کا قول ہے تو وہ اس سال پیدا ہوئی ہوں گی) اس لئے اجلہ صحابہ کی روایت اس واقعہ میں ان کی روایت سے مقدم ہے۔ مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضؓ نے بے تحقیق ایک بات فرما دی ہم حضرت صدیقہ رضؓ پر یہ گمان نہیں کریں گے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرأت ہو سکتی ہے۔ یہ مانا کہ وہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کمسن بھی تھیں۔ مگر جو بات وہ فرما رہی ہیں وہ تو عقل و بلوغ کے زمانہ میں ان سے صادر ہوئی اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں۔ یقیناً تحقیق کے بعد فرما رہی ہیں۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرما رہی ہوں کیونکہ تعدد ہے۔ تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں۔

میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنیٰ ہیں، ایک شئے تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہو جانا ہٹ جانا۔ دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنیٰ میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ قالوا واقبلوا علیهم ماذا تفقدون یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہو کر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم لوگ کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنیٰ طلب ہی کے ساتھ زیادہ ظاہر ہیں۔ پس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ کی تلاش کی جاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات میں اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے معراج منامی یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب[ع] یہ ہے کہ گھر سے جدا تو ہوئے۔ مگر زیادہ دیر

ع اور اگر فقدان کے وہی معنیٰ لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب معراج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا ہی نہیں ہوئے کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کہ لازم۔ اس کے معنیٰ غیبت و انفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے اس کا فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا۔ اور یہ روایت درست ہے کیونکہ آپ سب گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے تھے۔ اور معراج ایسے وقت ہوئی جو کہ عادۃً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کے وقت سے پہلے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود آ کر گھر والوں کو صبح کی نماز کے لئے جگایا۔ تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو۔ اور اتنی بات مفقود ہونے کے لئے ضروری ہے۔ قلت ولعل هذا هو مراد الشيخ فعبره بالتفتيش والا فالفقدان غير التفقد، نعم

نہیں لگی۔ جس میں گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ (الرفع والوضع ص۳۴)

بقیہ گذشتہ:۔ وهو يستدعى فاقداً كما لا يخفى (جامع) احقر اشرف علی کے ذہن میں پہلا حاشیہ دیکھ کر ہی یہ تاویل آگئی تھی۔ مگر دوسرے عنوان سے پھر یہ اب اس تاویل کی اس دوسرے عنوان سے ذرا واضح تقریر کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ فقدان کے معنیٰ تو گم ہی کرنے کے ہیں مگر اس کے دو درجے ہیں، ایک مطلق گم کرنا اور ایک ایسا گم کرنا جس کے بعد اسکی تلاش میں لگ جاوے پس پہلا درجہ فقد مطلق ہوا اور دوسرا درجہ فقد مقید۔ پس اس حدیث میں دوسرا درجہ مراد ہے یعنی آپ کا جسد ایسا مفقود نہیں ہوا جس سے تلاش کی نوبت آئی ہو، کیونکہ زمانہ فقد کا اتنا قلیل تھا کہ کسی کو اس فقد کی اطلاع بھی نہیں ہوئی۔ پس متن میں میری عبارت میں ہٹ جانے کو پہلے درجہ پر اور تلاش کرنیکو دوسرے درجہ پر محمول کیا جاوے تو اب معنیٰ لغوی کے خلاف نہیں ہوا۔ اور بنا بر قواعد تصوف یہ بھی ممکن ہے کہ جسم عنصری ملکوت میں پہونچا ہو اور جسم مثالی ناسوت میں رہا ہو۔ اسکے دیکھتے ہوئے کسی نے اسکو جسم عنصری سمجھ کر ما فقد کا حکم کر دیا ہو۔ اور موٹی بات ہے کہ اگر معراج جسم عنصری سے نہ ہوتی تو اتنا انکار اسپر نہ ہوتا اور اگر غلط فہمی سے ہوتا تو آپ بھی جواب دے دیتے کہ میں جسد عنصری سے دعویٰ نہیں کرتا کہ اسپر اس قدر استبعاد کیا جاوے ۱۲ منہ۔

احقر ظفر احمد عرض کرتا ہے کہ بعد میں تفسیر تنویر المقباس میں جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کیطرف منسوب ہے۔ ماذا تفقدون اور تفقد کی تفسیر ماذا تطلبون اور تطلب کے ساتھ میری نظر سے گذری۔ اور یہ تفسیر بالکل اسی معنیٰ کے مطابق ہے جو حضرت حکیم الامت نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں، کیونکہ طلب کے معنیٰ تلاش کرنے اور ڈھونڈنے کے ہی ہیں۔ اور بظاہر ابن عباسؓ کی یہ تفسیر باللازم ہے کیونکہ فقدان اکثر طلب کو مستلزم ہوتا ہے لہذا ملزوم کی تفسیر لازم سے فرما دی لیکن اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ گاہے فقدان سے طلب و تفتیش بھی مراد ہوا کرتی ہے۔ پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول میں بھی اس معنیٰ کا احتمال ہے جیسا کہ حضرت مولانا نے فرمایا واذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال اور ہر چند کہ تفسیر تنویر المقباس اکثر محدثین کے نزدیک معتبر نہیں کیونکہ اس کے راوی کلبی اور ان کے شاگرد محمد بن مروان سدی صغیر مجروح ہیں۔ مگر سیوطی نے اتقان میں ابن عدی کا یہ قول نقل کیا ہے۔ لکن قال ابن عدى فى الكامل للكلبى احاديث صالحة وخاصة عن ابى صالح وهو معروف بالتفسير وليس لاحد تفسير اطول منه ولا اشبع (ص۱۶۶ ج۲) جس سے فی الجملہ اسکی تقویت ہوتی ہے۔ دوسرے یہ مسئلہ کوئی احکام کی قبیل سے نہیں جس میں راوی کا مجروح ہونا مضر ہو بلکہ از قبیل نقل لغت ہے جس میں بہت وسعت ہے۔ فافهم والله اعلم. وانما اطلنا الكلام فى هذا المقام ليظهر لك نعمة الله على جماعتنا ولله الحمد انها لا تقبل اقوال اكابرها فى تفسير معانى القرآن الا بعد ظهور مطابقتها لاقوال السلف وان اكابرها لا تتكلمون لا يراد الاصاغر عليهم اذا كان بالادب لاجل الطلب ليظهر لك حسن ذوق حضرت حكيم الامة فى التفسير بحيث لا يتخطى عن الصواب ولو قال شيئا بغير مطالعة الكتاب. (تمت الحاشية)

۶۵- تبلیغ کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام علماء کے سپرد نہیں کرنا چاہیئے

میں کہتا ہوں کہ علماء یہ کام ہرگز نہ کریں بلکہ رؤسا و عوام خود چندہ کریں اور مولویوں سے دین کا کام لیں۔ مگر آج کل تو علماء کی مثال ڈوم کے ہاتھی جیسی ہو رہی ہے کہ اکبر نے ایک ڈوم کو ہاتھی انعام میں دیدیا تھا وہ بڑا گھبرایا کہ میں اس کا خرچ کہاں سے لاؤں گا آخر ایک دن اکبر کی سواری نکلنے والی تھی کے گلے میں ڈھول ڈالکر راستہ میں چھوڑ دیا۔ اکبر نے دیکھا کہ شاہی ہاتھی گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے پھر رہا ہے پوچھا یہ کیا قصہ ہے۔ ڈوم کو بلایا گیا کہ تم نے اس ہاتھی کے گلے میں ڈھول کیوں لٹکایا ہے۔ کہا حضور آپ نے مجھے ہاتھی تو دے دیا اب میں اسے کھلاتا کہاں سے میں نے اس سے کہا کہ بھائی میں تو گا بجا کر کھاتا ہوں تو ڈھول گلے میں ڈالکر گا کر بجا کر اپنا پیٹ بھرے۔ اکبر ہنس پڑا۔ اور ڈوم کو اس کی امداد کے لئے بھی عطا فرمایا۔

یہی حال آج کل مولویوں کا ہے کہ لوگوں نے ان کے گلے میں ڈال دیا ہے کہ جاؤ گاؤ بجاؤ اور روپیہ جمع کر کے خود ہی سب کام کرو۔ یاد رکھو ایک جماعت سے دو کام نہیں ہو سکتے کام کا طریقہ یہی ہے کہ روپیہ تم خود جمع کرو۔ اور مولویوں سے صرف دین کا کام لو بلکہ روپیہ جمع کر کے اپنے ہی پاس رکھو علماء کو روپیہ دو بھی نہیں۔ کیونکہ آج کل بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو واقع میں مولوی نہیں تھے مگر مولویوں میں جا گھسے۔ انہوں نے مسلمانوں کے چندوں میں بہت خیانتیں کی ہیں جس سے مولوی بدنام ہو گئے اسلئے میری رائے یہ ہے کہ رؤسا چندہ کر کے اپنے ہی پاس رکھیں۔ مولویوں کو نہ دیں۔ کیونکہ اس سے علماء پر دھبہ آتا ہے تو کیا آپ کو یہ گوارا ہے کہ آپ کے علماء بدنام ہوں۔ ہرگز نہیں۔ آپ کو تو چاہیئے کہ اگر علماء چندہ کرنا بھی چاہیں تو آپ ان کو خود روکیں کہ یہ کام آپ کے مناسب نہیں۔ یہ کام ہم خود کریں گے۔ بلکہ ایک صورت سب سے اچھی یہ ہے کہ ایک ایک رئیس ایک ایک مبلّغ کی تنخواہ اپنے ذمہ کر لے اس میں کسی جھگڑے ہی کی ضرورت نہیں۔ اور اگر ایک آدمی ایک مبلّغ کی تنخواہ نہ دے سکے تو دو چار مل کر ایک مبلّغ رکھ لیں اور اس کا حساب خود اپنے پاس رکھیں۔ یہ صورت تو روپیے کے انتظام کی ہے۔ رہا تبلیغ کا قاعدہ اور طریقہ۔ یہ علماء کی

رائے سے ہونا چاہیئے۔ تم روپیہ جمع کر کے علماء سے طریقہ پوچھو اور مبلغ بھی ان کی رائے سے مقرر کرو، پھر جس طرح وہ بتلائیں اس کے موافق کام کرو۔ اس مشورہ کے لئے ایک کمیٹی بناؤ۔ علماء کو اس میں مشورہ اور رائے دینے سے انکار نہ ہوگا۔ اور میں علماء سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اس سے انکار نہ کریں پھر اس طرح اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد کامیابی ہوگی۔ گو اول اول دقتیں بھی پیش آئیں گی مگر دقت سے نہ گھبرائیں۔ پیادہ سفر کرنے کی ضرورت نہیں سواری میں سفر کریں جہاں ریل ہو وہ ریل سے پہونچے۔ ورنہ گاڑی بہلی سے جائیں باقی فٹن اور موٹر کی ضرورت نہیں نہ کیمنیڈ اور برف کی ضرورت ہے۔ ان فضولیات میں پیسہ قوم کا برباد نہ کرنا چاہیئے۔ آپ کا تو یہ رنگ ہونا چاہیئے۔ ؎

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی ؎
بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(العلم والخشیۃ ص۲۱)

۶۶- نسب نامے نہ تو محض بیکار ہیں، اور نہ ہی مدارِ فخر ہیں۔

حق تعالیٰ نے مختلف خاندانوں اور قوموں کے بنانے میں یہ حکمت بتلائی ہے کہ اس سے تعارف اور شناخت ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کا پتہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ قریشی ہے یہ انصاری ہے یہ صدیقی ہے یہ فاروقی ہے اگر یہ تفاوت نہ ہوتا تو امتیاز سخت دشوار ہوتا۔ کیونکہ ناموں میں اکثر توارد ہوتا ہے ایک ہی نام کے بہت سے آدمی ہوتے ہیں۔ تو کسی قدر تو جائے سکونت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک دہلوی ہے ایک لکھنوی ہے۔ پھر ایک شہر میں بھی ایک نام کے بہت سے ہوتے ہیں تو محلوں کے نام سے امتیاز ہو جاتا ہے کہ ایک محلت کا رہنے والا ہے اور ایک محلہ خیل کا۔ پھر وہاں بھی ایک نام کے دو تین ہوتے ہیں تو قبائل کی طرف نسبت سے امتیاز ہو جاتا ہے۔ یہ حکمت ہے اختلاف قبائل کی۔

مگر آج کل ہمارے بھائیوں نے اس کو مدار فخر بنا لیا ہے۔ اب یہاں دو قسم کے لوگ

ہوگئے۔ بعض نے تو نسب و شرف کی جڑ ہی اکھاڑ دی۔ ان کو اس سے شبہ ہوا کہ اس آیت میں اختلاف قبائل کی حکمت صرف تعارف بتلائی گئی ہے اور حکمتوں سے سکوت کیا گیا ہے تو انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بس اس میں اور کچھ حکمت نہیں ہے۔ لان السکوت فی موضع البیان بیان۔ اس پر نظر کر کے بعض نے تو شرافت نسب کا انکار ہی کر دیا کہ اس سے شرف کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ جس طرح دہلوی، لکھنوی، ہندوستانی، بنگالی یہ سب نسبتیں تعارف کے لئے ہیں اور ان سے کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اسی طرح قریشی، انصاری، سید، فاروقی، عثمانی وغیرہ یہ نسبتیں بھی شناخت کے لئے ہیں ان سے بھی کچھ شرف حاصل نہیں ہوتا اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس شرفِ عرفی سے محروم ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو اپنے کو شریف ثابت کرنا چاہا ہے۔ چنانچہ ایک قوم نے اپنا عرب ہونا ثابت کیا ہے اور کہا ہے کہ ہماری اصل راعی ہے چونکہ یہ لوگ جانور پالتے ہیں اسلئے ان کو راعی کہا گیا۔ پھر غلط عوام سے لفظی تغیر ہو گیا۔ اسی طرح بعضوں نے اپنے آپ کو خالد بن ولید کی اولاد میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی طرح وہ عرب بنا چاہتے ہیں مگر اس ترکیب میں تکلف تھا کیونکہ تاریخ سے تو اس کا کچھ ثبوت نہیں ملتا محض قیاسات بعیدہ سے کام لینا پڑتا ہے جس سے ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بات بنائی ہوئی ہے اسلئے بعض نے اپنے نقص کو یوں دور کرنا چاہا کہ اہل شرف ہی سے اس شرف نفی کر دی کہ شرافت، نسبت کوئی چیز نہیں۔ بعض نے اس نفی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول سے استدلال کیا ہے ؎

الناس من جهة التماثل اکفاء ابوهم آدم والام حواء۔
وما الفخر الا لاهل العلم انهم علی الهدی لمن استهدی ادلاء

ترجمہ:۔ آدمی صورت کے اعتبار سے سب برابر ہیں کیونکہ سب کے باپ آدم علیہ السلام اور ماں حوا علیہا السلام ہیں۔ پس اہل علم کے سوا کسی کے لئے فخر نہیں ہے۔ کیونکہ وہی ہدایت پر بھی ہیں اور طالب ہدایت کی طرف رہنمائی بھی کرتے ہیں۔ اس سے بعض وہ حضرات جو نسبی شرف نہیں رکھتے اور علم حاصل کر چکے ہیں اس پر استدلال کرتے ہیں کہ شرف نسب کوئی چیز نہیں۔ بس شرف اگر ہے تو علم سے ہے۔ سو اول تو یہی معلوم نہیں کہ یہ حضرت علی کا قول ہے یا نہیں پھر جس کا بھی قول ہے مطلب نفی فخر ہے کہ نسب پر فخر نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ امر غیر اختیاری ہے اور اس پر فخر نہ کرنا چاہیئے۔ مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حسن صورت اور سوانکھا ہونا نعمت بھی نہیں۔ یقیناً اعلیٰ درجہ کی نعمت ہے۔ اسی طرح یہاں سمجھو کہ گو شرف نسب بوجہ امر غیر اختیاری ہونے کے سبب فخر نہیں مگر اس کے نعمت ہونے میں شبہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی فضیلت بیان فرمائی

ہے۔ انصار کے فضائل بیان فرمائے ہیں۔ اور ایک حدیث میں ہے۔ الناس معادن کمعادن الذهب والفضة خیارهم فی الجاهلیة خیارهم فی الاسلام اذا فقهوا کہ جیسے چاندی سونے کی کانیں ہیں اسی طرح آدمیوں کی بھی مختلف کانیں ہیں جن میں بعض سونے کے مشابہ ہیں۔ بعض چاندی کے، بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں بعض دوسرے معادن کے مثل ہیں پھر آپ فرماتے ہیں کہ جو خاندان جاہلیت میں اچھے شمار ہوتے ہیں وہی اسلام کے بعد بھی اچھے ہیں۔ جب کہ علم حاصل کریں۔ بعض نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں قید اذا فقهوا اہل انساب کو مضر ہے کہ اس میں مدار فضل فقہ کو فرمایا۔ مگر کچھ بھی مضر نہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فقہ کے بعد خیار فی الجاهلیة کو خیار فی الاسلام فرما رہے ہیں۔ تو فقہ کے بعد مساوات نہ رہی بلکہ حاصل یہ ہوا کہ فقیہ غیر صاحب نسب فقیہ صاحب نسب کے برابر نہیں بلکہ فقیہ صاحب نسب افضل ہوگا تو کوئی تو بات ہے جس سے وہ خیار ہوئے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ صاحب نسب جاہل سے غیر صاحب نسب عالم افضل ہے۔ اس کا ہم کو انکار نہیں۔ مگر حدیث سے اتنی بات معلوم ہو گئی کہ شرف نسب بھی کوئی چیز ضرور ہے جس کے ساتھ علم و فقہ مل جائے تو صاحب نسب غیر صاحب نسب سے بہتر ہوگا نیز حدیث میں ہے الائمة من قریش کوئی توجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امارت کو قریش کے ساتھ مخصوص فرمایا معلوم ہوا کہ اہل انساب میں شان متبوعیت دوسروں سے زیادہ ہے انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب۔ جب جنگ حنین میں حضرات صحابہ کے پیر اکھڑ گئے۔ اور وہ پیچھے ہٹنے لگے تو آپ نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ میں نبی ہوں، یہ جھوٹ بات نہیں (اسلئے میرا غلبہ یقینی ہے) اور میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ یعنی میں خاندانی اور صاحب نسب ہوں۔ میں ہرگز پسپا نہ ہوں گا تو اس میں حضور نے اپنے صاحب نسب ہونے پر فخر کیا ہے۔ اور دشمن کو ڈرایا ہے کہ تو اپنے مقابل کو کم نہ سمجھنا، وہ بڑا خاندانی ہے جس کی بہادری سب کو معلوم ہے۔ اگر شرف نسب کوئی چیز نہیں ہے تو آپ نے انا ابن عبد المطلب کیوں فرمایا نیز ایک حدیث میں ہے۔ ان اللہ اصطفی من ولد ابراهیم اسمٰعیل واصطفی من ولد اسمٰعیل بنی کنانة واصطفی قریشا من کنانة واصطفی من قریش بنی هاشم واصطفانی من بنی هاشم (رواہ مسلم والترمذی)۔

یعنی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے اسمٰعیل علیہ السلام کو انتخاب فرمایا (اس سے عرب کی فضیلت عجم پر ثابت ہوئی، کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام ابو العرب ہیں۔ اور ایک روایت میں اس کی تصریح بھی ہے۔ اختار اللہ العرب من بنی آدم۔ اور اسمٰعیل علیہ السلام کی

اولاد میں سے کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ میں سے قریش کو منتخب کیا اور قریش سے بنو ھاشم کو اور بنو ہاشم میں سے مجھکو منتخب کیا۔ اور ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ ان اللّٰہ خلق الخلق فجعلنی فی خیرھم (ای الانس) ثم جعلھم فرقتین فجعلنی فی خیرھم فرقۃ (ای العرب) ثم جعلھم قبائل فجعلنی فی خیرھم قبیلۃ (ای قریش) ثم جعلھم بیوتا فجعلنی فی خیرھم بیتا (ای بنی ھاشم) فانا خیرھم نفسا وخیرھم بیتا (رواہ الترمذی)۔

اس نص سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسب مطلق کرم سے خالی نہیں۔ گو اگر ہونے کو مستلزم نہ ہو۔ کیونکہ اکرمیت کا مدار تو تقویٰ ہے۔ ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقکم۔ مگر اس کرم بالنسب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سارے کام کو نسب ہی میں منحصر کر دیا جائے جیسا کہ اہل قصبات کی عادت ہے یہ دوسری جماعت ہے جس نے نسب کے بارے میں افراط وغلو کیا ہے۔ جیسا کہ پہلی جماعت نے تفریط کی تھی۔ اہل قصبات نے فخر بالانساب ہی پر قناعت کرلی ہے۔ الاکرمیۃ بالاعلمیۃ والاعملیۃ) (ص۵ تا ۹ ملخصًا)

۶۷- نماز کی برکتیں اور اس کے نہ پڑھنے پر ترہیب

اس وقت واقعی طور پر ان کو حی علی الفلاح کا ادراک ہوتا ہے کہ نماز عجیب راحت کی چیز ہے۔ یہ تو نماز میں فلاح عاجل باطنی ہے اور اس کے علاوہ نماز میں ظاہری فلاح عاجل بھی بہت کچھ ہے چنانچہ نماز میں ایک یہ ہے کہ اگر کوئی آپ کو فضول مخالطت فضول مظالمت سے ایذا دینا چاہے تو نماز شروع کردو۔ جب تک نماز پڑھتے رہوگے کوئی تمہیں کچھ نہ کہے گا۔ دوسرے اگر تم کسی آنے والے کی تعظیم نہ کرنا چاہو اور تعظیم نہ کرنے میں خطرہ کا اندیشہ ہو تو اس کو آتا ہوا دیکھ کر نماز شروع کردو۔ اس طرح تعظیم سے بھی بچے رہوگے اور دوسرے کو اپنی بے تعظیمی کا خیال نہ ہوگا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ نماز میں انسان دوسری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ تیسرے اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس طرح خلوت اختیار کروں کہ گوشہ نشینی بھی مشہور نہ ہوں۔ کیونکہ اس شہرت کے بعد پھر خلوت نہیں رہ سکتی۔ لوگ تنگ کرتے اور ہجوم کرنے لگتے ہیں تو اس کی سہل صورت یہ ہے کہ ہر وقت نفل نماز پڑھا کرے۔ ہمارے ایک عزیز بزرگ نے جو مشرب سماع رکھتے تھے اسی طرح خلوت اختیار کی تھی کہ بیٹھک ہی میں عام منظر پر رہتے اور ہر وقت نماز پڑھتے تھے جب کوئی

ملنے آیا تو سلام کے بعد دو چار باتیں خیریت کی پوچھ لیتے اور پھر نماز شروع کر دیتے تھے۔ مجھے یہ طریقہ بہت پسند آیا کہ نہ وہ بداخلاق مشہور ہوئے۔ کیونکہ جو کوئی بھی آتا تھا۔ اس سے ضرورت کی قدر مل بھی لیا کرتے تھے۔ اور نہ عزلت گزینی میں فرق آیا۔ اور نہ خلوت نشین مشہور ہوئے۔ جو عوام کا ہجوم ہوتا ایک برکت نماز کی یہ ہے کہ اس میں بڑے بڑے سلاطین اور رؤسا کی برابری ہوجاتی ہے۔

نماز میں مساوات

ایک انگریز علی گڈھ کالج میں گیا تو وہاں دیکھا کہ رئیسوں کے لڑکے پڑھتے ہیں۔ مگر خدمت کے تو وہ نوکر دور کھڑے رہتے ہیں آقا کے پاس بھی نہیں بیٹھ سکتے اور نماز کے وقت آقا کے برابر پاس مل کر کھڑے ہوتے ہیں اس نے ان رئیس زادوں سے دریافت کیا کہ نماز میں برابر کھڑے ہونے سے یہ ملازم گستاخ نہیں ہوجاتے انہوں نے کہا مجال ہے جو نماز کے بعد ہماری ذرا بھی برابری کرسکیں۔ اس وقت کا حق یہی ہے کہ سب برابر ہوں اور دوسرے وقت کا دوسرا حکم ہے۔ اس کو اس سے بڑی حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جو نوکر نماز پڑھتا ہے حالانکہ وہ نماز میں آقا کے برابر بھی ہوجاتا ہے مگر پھر بھی اس میں انقیاد کی صفت بڑھ جاتی ہے۔ یعنی وہ آقا کی خدمت اور اس کے حقوق کی بجا آوری بے نماز نوکر سے زیادہ کرتا ہے واقعی یہ بات مشاہد ہے کہ دیندار آدمی جیسے خداتعالیٰ کے حقوق ادا کرتا ہے بندوں کے حقوق بھی خوب ادا کرتا ہے۔ نماز کی ایک برکت یہ ہے کہ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ اطباء بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اخلاق حمیدہ وافعال حسنہ کا اثر صحت پر بہت اچھا پڑتا ہے اور افعال بد سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ تجربہ کرکے دیکھ لیا جاوے کہ ایک آدمی نمازی ہو اور ایک بے نمازی۔ تو نمازی کی صحت بے نمازی سے ضرور اچھی ہوگی۔ (مگر دونوں یکساں قوی اور قریب قریب بدن کے لینے چاہئیں) بلکہ ایک حدیث سے تو جو ابن ماجہ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے گو محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے ذریعہ سے بعض امراض کا علاج کیا ہے۔ ایک دفعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیٹ میں درد تھا۔ وہ آہ آہ کر رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کو تشریف لے گئے اور فارسی میں فرمایا شکمت درد۔ قال نعم۔ قال قم فصل فزال وجع بطنہ، کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے۔ کہا۔ ہاں۔ فرمایا کھڑے ہوکر نماز پڑھو چنانچہ نماز پڑھتے ہی درد زائل ہوگیا۔ چونکہ یہ مسئلہ احکام میں سے نہیں اس لئے ضعف حدیث اس میں مضر نہیں۔ میں یہ تو دعویٰ نہیں کرتا کہ نماز پڑھنے سے ہمیشہ درد زائل ہوجایا کرے گا ممکن ہے کسی عارض سے اس نفع کا ظہور نہ ہو مگر یہ تو ضرور ہے کہ نماز سے ایک خاص سرور ونشاط اور

قلب کو راحت حاصل ہوتی ہے جس کا اثر صحت پر بھی ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ہم کو اس کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ نماز سے راحت و سرور کیوں ہوتا ہے کیونکہ ہر اثر کے لئے کسی علت کا ہونا ضروری نہیں ہے بعض چیزیں بالخاصہ مؤثر ہوتی ہیں۔ دیکھئے مقناطیس میں جو جذب حدید کی خاصیت ہے اس کی وجہ کوئی نہیں بتلا سکتا۔ اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ نماز میں یہ اثر بالخاصہ ہے جس کی علت بتلانیکی ہمیں ضرورت نہیں۔

جماعت کی اہمیت

افسوس اتنی بڑی عبادت جس میں فلاح اخروی بھی ہے اور فلاح دنیوی بھی ہے اور ہم اس سے ایسے غافل ہیں کہ پانچ وقت خدا کی طرف سے ایک منادی ہم کو پکارتا ہے اور ہم جماعت میں نہیں آتے۔ حالانکہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ولقد هممت ان امر بالصلوٰة الیٰ ان قال احرق بیوتهم بالنار کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز میں ایک شخص کو امام بتاؤں پھر چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دیکھوں کہ کون کون لوگ جماعت میں نہیں آئے۔ پھر جو جماعت سے پیچھے رہتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے گھر پھونک دوں اور گو آپ نے ان لوگوں کے گھروں کو پھونکا نہیں مگر چاہا تو تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ انی اری ربک یسارع فی هواک کہ میں حق تعالیٰ کو دیکھتی ہوں کہ آپ کی خواہش کو بہت جلد پورا کر دیتے ہیں اور بھلا حضور کی یہ شان کیوں نہ ہو جب ادنیٰ ادنیٰ مقبولین کی یہ شان ہے ؎

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں می دہد یزداں مراد متقیں!

تو معلوم ہوا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا چاہا ہے تو خدا تعالیٰ نے بھی ضرور چاہا ہے۔ اب بتاؤ جس کے گھر کو خدا اور رسول پھونکنا چاہیں وہ کیونکر بچ سکتا ہے تو جو لوگ جماعت میں نہیں آتے ان کے گھر میں ضرور آگ لگی ہے۔

شاید تم کہو کہ ہمارا گھر کہاں جلا وہ تو اچھا خاصا موجود ہے تو اسکے متعلق مولانا روم کا جواب سن لو، فرماتے ہیں ؎

آتشے گر نامدست ایں دود چیست جاں سیہ گشت و رواں مردود چیست

یہ تھوڑی آگ لگی ہے جس کے دھوئیں نے دل کو سیاہ کر دیا ہے اور چہرہ پر وحشت و ظلمت برس رہی ہے۔ اس حکمت طلب سے بے نمازی کے چہرہ پر بھی ضرور ایک اثر ہوتا ہے جس سے اس کا بے نمازی ہونا لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ نمازی کے چہرہ پر جو نور ہوتا ہے اس کا

چہرہ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور بے نمازی کے دل میں ظلمت ہے اس کا چہرہ بد رونقی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگ ضرور لگی ہے۔ اسی کا یہ دھواں ہے جس نے ظاہر و باطن دونوں کو سیاہ کر دیا ہے۔

(الاکرمیۃ صہ ۱۹ تا ۲۲ ملخصًا)

۶۸ - اتحاد و اتفاق میں حدود کی رعایت

اتحاد مطلوب کے دو درجے ہیں۔ ایک اس کا حدوث، دوسرے بقاء، میں ان دونوں درجوں کے اسباب بیان کروں گا کہ حدوث اتحاد کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے اور اس کے بقاء کا کیا طریقہ ہے اور وہ اسباب ایسے ہیں جو شرعی پہلو سے بھی ظاہر ہیں اور عقلی پہلو سے بھی، اور اسباب بقا کی تحقیق زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ آجکل ہم لوگوں میں اتحاد و اتفاق تو پیدا ہوتا ہے مگر باقی نہیں رہتا۔ میں اس کا سبب شرعی پہلو سے بتلاؤں گا، جو عقل کے بھی مطابق ہے۔ گو مجھے عقل کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کیونکہ عقل باندی ہے اور شریعت سلطان ہے پس عقل کی تائید سے شریعت کی بات کو ماننا ایسا ہے جیسے غلام کی جی ہاں جی ہاں کو سن کر بادشاہ کی بات کو مانا جائے اور اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے۔ بادشاہ کی بات خود حجت ہے غلام کی تصدیق سے اس کو حجت سمجھنا سراسر حماقت ہے مگر کیا کیا جائے آج کل عقل پرستی کا غلبہ ہے لوگوں کی سمجھ میں وہی بات آتی ہے جو عقل کے مطابق ہو۔ اس سے تبرعًا میں عقلی پہلو سے بھی ان اسباب کو بیان کروں گا کہ میرا اصلی مذاق اس کے خلاف ہے۔

پس سنیئے کہ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ ہم لوگوں میں اتحاد باقی نہیں رہتا۔ بلکہ ایک اتحاد ہی کیا ہے مجھے تو ایسی بدگمانی ہے کہ جب میں سنتا ہوں کہ مسلمانوں نے کوئی کام شروع کیا ہے تو سب سے پہلے یہ خیال ہوتا ہے کہ دیکھئے استقلال کے ساتھ چلے گا بھی یا نہیں کیونکہ میں رات دن دیکھتا ہوں کہ نہ ہمارے کارخانے چلتے ہیں نہ انجمنیں، نہ مدرسے نہ اتحاد و اتفاق۔ ہاں ایک چیز ہمیشہ چلتی ہے وہ کیا جوتا اور لٹھ یہ ایک بار جہاں چلا عمر بھر چلتا رہتا ہے۔ چاہے اس کی بنیاد کیسی ہی کمزور ہو مگر شاخیں مضبوط ہو جاتی ہیں۔ جیسے عرب میں جاہلیت کے زمانہ میں ایک گھوڑ دوڑ ہوئی تھی جس میں ایک فریق کا گھوڑا آگے نکل گیا تھا تو اسی بات پر صدیوں لڑائی رہی۔ ہماری حالت آج کل اہل جاہلیت کی حالت کی مشابہ ہے کہ جہاں ذرا سی بات پر جوتہ چلا پھر وہ برسوں تک چلتا رہتا ہے۔ باقی اتحاد و اتفاق۔ اس کی عمر ہمارے یہاں بہت تھوڑی ہے۔ گو بکثرت حدوث اتحاد کی بہت کوشش کرتے رہتے ہیں اور اس پر تقریریں

بہت ہی ہوتی ہیں ۔ مگر آج کل کسی نے بقاءِ اتحاد کے اسباب بیان نہیں کئے ۔ نہ عدم بقاء کے اسباب کو مرتفع کیا۔ حالانکہ سب سے پہلے یہ مسئلہ قابل غور تھا ۔ اس لئے اس وقت میں اسی کو بیان کرنا چاہتا ہوں ۔ اور اسی کے ضمن میں اسباب صحیحہ حدوث کے بھی مذکور ہو جائیں گے ۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں (پس اگر کبھی ان میں نزاع ہو تو) اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو ۔ یہاں "فاصلحوا بین اخویکم" میں اس پر تنبیہ ہے کہ پنچوں کو کسی ایک فریق کی اعانت نہیں کرنا چاہیے بلکہ دونوں کو اپنا بھائی سمجھ کر اس طرح صلح کرانا چاہیے ۔ جیسے حقیقی دو بھائیوں میں صلح کرائی جاتی ہے کہ ان میں سے کسی کا نقصان گوارا نہیں ہوتا ۔ اور صلح کا یہ طریقہ نہیں جو آج کل رائج ہے کہ دونوں فریق کو کچھ کچھ دبایا جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ جس کا حق ہوتا ہے اس کو بھی دبایا جاتا ہے بلکہ صلح کرانیکا طریقہ یہ ہے کہ جو حق پر ہو اس کو غلبہ دیا جائے اور جو حق پر نہ ہو اس کو دبایا جائے، کیونکہ صاحب حق کو دبانا اضرار ہے ۔ اور غیر صاحب حق کو دبانا اضرار نہیں اس میں تو اسے اضرار سے روکنا ہے ۔

اصلاح کا طریقہ

مگر آج کل عجیب دستور ہے کہ صاحب حق و غیر صاحب حق دونوں کو دباتے ہیں ۔ سو یہاں اصلاح سے یہ مراد نہیں جس کی دلیل یہ ہے کہ اس سے پہلے ارشاد ہے ۔ وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىہُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰہِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۔

یعنی اگر مسلمانوں کی دو جماعتیں باہم لڑنے لگیں تو دونوں میں (اول) صلح کراؤ ۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر ظلم کرے تو جو زیادتی اور ظلم کرے تو اس سے مل کر قتال کرو ۔ یہاں تک کہ وہ حکم الٰہی کی طرف واپس آجائے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اصلاح کے معنیٰ یہ ہیں کہ حکم الٰہی کے موافق فیصلہ کیا جاوے اور یقیناً صاحب حق کو دبانا حکم الٰہی کے خلاف ہے پس اگر فریقین حکم الٰہی کیمطابق فیصلہ پر راضی ہو جائیں تو فبہا ۔ جو ظلم پر کمربستہ ہو اور دوسرے کا حق مارنا چاہتا ہے سب کو اس سے لڑنے کا حکم ہے یہ حکم نہیں ہے کہ بس جس طرح ہو صاحب حق کا گلا گھونٹ گھانٹ کر لڑائی موقوف کرا دو ۔ آج کل لوگوں نے اصلاح اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ بس لڑائی موقوف ہو جائے چاہے صاحب حق کو ہی دبا دیا جائے مگر شریعت نے اس کو اصلاح ہی نہیں سمجھا بلکہ شرعاً اصلاح یہ ہے کہ حق بحقدار رسد ۔ اور جو دوسرا فریق حق دار کے حق میں پس و پیش کرے تو پھر یہ حکم ہے کہ

سب مل کر اس کو دباؤ اور لڑائی کی ضرورت ہو تو اس سے لڑو اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح میں بعض دفعہ سختی اور قتال کرنا بھی مستحسن ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ نااتفاقی کی غرض سے اتفاق کرنا تو برا ہے اور اتفاق کی غرض سے نااتفاقی کرنا جائز بلکہ واجب ہے ۔ مثلاً اس غرض سے اتفاق کریں کہ پانچویں سے نااتفاقی کریں گے ۔ یہ مذموم ہے اور یہیں سے معلوم ہو گیا کہ اگر خدا تعالیٰ سے نااتفاقی کرنے پر اتفاق ہو ۔ یعنی معاصی پر اجتماع ہو تو وہ کیوں برا نہ ہوگا ۔ یقیناً یہ اتحاد سب سے بدتر ہے ۔ مگر آج کل لوگوں نے اتفاق کا نام یاد کر لیا ہے اور اس کو مطلقاً محمود سمجھتے ہیں حدود کی رعایت نہیں کرتے یہ بالکل غلط ہے ۔ شریعت میں نماز تک کے لئے حدود ہیں کہ طلوع و غروب اور دوپہر کے وقت اور بغیر استقبال قبلہ کے نماز حرام ہے ۔ اسی طرح ذکر اللہ کے لئے حدود ہیں کہ ذکر میں نیند آجائے تو سونے کا حکم ہے اس وقت ذکر ممنوع ہے ۔ شریعت کا مقصود ان حدود سے یہ ہے کہ بندہ کا غلام ہونا چاہیے ۔ جس وقت جو حکم ہو اس کا امتثال کرے ، چاہے عبادت کا حکم ہو ، یا ترک عبادت کا ، بس وہ شان ہو ؎

من چوں کلکم درمیان اصبعین
نیستم در صف طاعت بین بین

اتحاد کے لئے حدود

قلم کی خوبی یہ ہے کہ جب چلائیں تو چلے اور جب روکیں رک جائے کیونکہ قلم اگر روکے سے بھی نہ رکے تو حرف بگڑ جاتے ہیں اسی طرح عبادات حدود شرعیہ کے خلاف معاصی ہیں اس لئے حکم ہے کہ نیند کے وقت ذکر موقوف کرکے سو رہو ، تو اتنی بڑی چیز غیر مستحسن ہونے کا شبہ ہی نہیں ہو سکتا وہ بھی ایک وقت میں ترک حدود کی وجہ سے مذموم ہو جاتی ہے ۔ تو اتحاد کے لئے حدود کیوں نہ ہونگی اور ان حدود کے خلاف جو اتحاد ہو وہ مذموم کیوں نہ ہوگا ۔ پس اتحاد کی بھی ہر فرد مستحسن نہیں اس کو علی الاطلاق محمود کہنا اتحاد کا ہیضہ ہے ۔ افسوس آج کل اتحاد کے فضائل بہت بیان کئے جاتے ہیں مگر اس کے حدود و اصول بیان نہیں کئے جاتے ۔

پس خوب سمجھ لو کہ خدا سے نااتفاقی کرنے پر اتفاق کرنا مذموم اور نہایت مذموم ہے ۔ پس اس سے اس اتحاد کا حکم سمجھ لیا جاوے جس میں اتحاد کے لئے شریعت کے احکام کو چھوڑا جاتا ہے ۔

صاحبو ! جیسے اتفاق مستحسن ہے ایسے ہی کبھی نااتفاقی بھی مستحسن ہے ۔ پس جو لوگ خدائے تعالیٰ کے احکام چھوڑنے پر اتفاق کریں ان کے ساتھ نااتفاقی کرنا اور مقابلہ کرنا محمود ہے

دیکھو جیسے عمارت بنانا محمود ہے ایسے ہی بعض عمارات گرانا بھی محمود ہے۔ اگر آپ اپنی رعایا سے کوئی مکان خریدیں اور اس میں بجائے کچے کوٹھڑوں کے عمدہ کوٹھی بنانا چاہیں تو ایسی عمارت کو گرائیں گے یا نہیں؟ یقیناً گرائیں گے۔ اب بتلائیے یہ افساد محمود ہے یا مذموم اس کے محمود ہونے میں کسی عاقل کا کلام نہیں ہوتا، پھر کسی موقعہ پر نااتفاقی کے محمود ہونے میں کیوں شبہ ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ جس طرح بھی ہو صلح کرادو۔ بلکہ یہ حکم دیا کہ صحیح بنیاد پر صلح کراؤ، اور اگر لوگ اس پر راضی نہ ہوں تو سب مل کر غلط بنیاد کو ڈھادو۔ پھر قتال کے بعد طائفہ باغیہ حق کی طرف رجوع ہوجائے حکم یہ ہے فان فاءت فاصلحوا بینهما بالعدل واقسطوا یعنی اب پھر ان کے معاملہ کی انصاف کے ساتھ اصلاح کرو یہ نہیں کہ بس لڑائی موقوف ہوتے ہی ان کا مصافحہ کرادو۔ اس میں بھی لوگ غلطی کرتے ہیں۔ بعض لوگ صلح کرانا اس کو سمجھتے ہیں کہ جہاں دو آدمیوں میں نزاع ہو فوراً دونوں کا مصافحہ کرا دیا جائے چاہے فریقین کے دل میں کچھ ہی بھرا ہو۔ میں کبھی ایسا نہیں کرتا۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ پہلے معاملہ کی اصلاح کرو ورنہ بدون اصلاح معاملہ کے نرا مصافحہ بیکار ہے۔ اس سے فریقین کے دل کا غبار نہیں نکلتا تو مصافحے کے بعد پھر مکافحہ شروع ہوجاتا ہے یعنی مقاتلہ، تو حق تعالیٰ نے "فاءت" کے بعد یہ نہیں فرمایا۔ "فکفوا ایدیکم" کہ زیادتی کرنے والا حق کی طرف رجوع ہو۔ پس تم ہاتھ روک لینے پر اکتفا کرلو، بلکہ فرماتے ہیں جب دوسرا فریق زیادتی چھوڑ دے تو اب پھر اصلاح معاملہ کی عدل کے ساتھ کوشش کرو۔ یہ قید یہاں ایسی بڑھائی گئی ہے جس پر ساری عقول قربان ہیں کیونکہ نزاع بدون اس کے ختم ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس نکتہ پر کسی کی عقل نہیں پہونچتی۔

اصلاح کا حاصل

بہر حال اصلاح کے نہ یہ معنیٰ ہیں کہ صاحب حق کو دیا جائے نہ یہ معنیٰ ہیں کہ محض مصافحہ کرا دیا جائے بلکہ اصلاح کے معنیٰ یہ ہیں کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کیا جائے۔ یہاں سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو آج کل علماء دیوبند اور جماعت رضائیہ میں اتفاق کرانا چاہتے ہیں اور دونوں جماعتوں پر باہمی نااتفاقی کا الزام دھرتے ہیں کہ اسلام کو ضرر پہونچ رہا ہے۔ سبحان اللہ، اس کے تو یہ معنیٰ ہوتے کہ ایک شخص کے گھر پر چور ڈاکہ ڈالیں اور وہ ان پر دعویٰ کردے تو دونوں فریق کو نااتفاق کا مجرم قرار دے کر دونوں کو اتفاق پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ اس صورت میں ہر عاقل چوروں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ مالک کا مال واپس کرکے اس سے اتحاد کریں مالک کو اتحاد پر کوئی مجبور نہیں کرتا۔ نہ اس کو دعویٰ دائر کرنے سے مجرم قرار دیتا ہے۔

دین پر ڈاکہ

اسی طرح علماء دیوبند کو جس جماعت سے اختلاف ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ وہ لوگ دین پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اور احکام میں تحریف کرتے ہیں۔ ان دونوں میں اتفاق کرانے کی صورت یہی ہے کہ اول حق و ناحق کو معلوم کیا جاوے پھر جو ناحق پر ہو اس کو دبایا جائے یہ طریقہ نہایت غلط ہے کہ حق و باطل کی تعیین سے پہلے ہی دونوں فریق کو اتفاق پر مجبور کیا جاتا ہے اور ہر ایک کو دبایا جاتا ہے۔ یہ اتفاق ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ (جامع)

اس پر فریقین اتفاق کرلیں تو خیر، ورنہ اس اتفاق کی طرف لانے کے لئے فریق مبطل سے نااتفاقی اور قتال کا حکم ہے، پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں "انما المؤمنون اخوۃ"، مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس میں حق تعالیٰ نے حکم اخوت کو صفت مومن پر مرتب فرمایا ہے اور اصول کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی صفت پر حکم مرتب ہوتا ہے وہاں وہ صفت حکم کی علت ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ہم میں جو اخوت کا تعلق ہے اس کی علت ایمان ہے اور وہی اخوت مطلوب ہے جس کی بنیاد ایمان پر ہو۔

صاحبو! آج کل جو اتفاق و اتحاد کو بقاء نہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ایمان پر نہیں ہوتی، بلکہ ہوائے نفسانی یا معاصی پر ہوتی ہے اس لئے وہ بہت جلد ہوا ہوجاتا ہے (یعنی فنا) اس لئے اگر اتفاق کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ایمان پر قائم کرو۔ مگر آج کل تو ایمان کو ایسی بیقدر چیز سمجھ رکھا ہے کہ اس کی کچھ وقعت ہی نہیں ہے۔ جس کی بنیاد ایمان پر رکھی جاتی ہے اس کے متعلق لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ تو ملانوں کا کام ہے۔ چنانچہ آج کل زبانوں پر یہ بات بہت کثرت سے ہے کہ یہ وقت نماز روزہ کا نہیں ہے اتحاد کا وقت ہے۔ اور جب کوئی اللہ کا بندہ اعتراض کرتا ہے کہ اتحاد کی وجہ سے احکام شرعیہ کا فوت کرنا جائز نہیں تو نہایت بے باکی سے جواب دیا جاتا ہے کہ یہ وقت جائز و ناجائز کا نہیں ہے۔ کام کا وقت ہے۔ اور غضب یہ ہے کہ اس متن پر بعض اہل علم نے حاشیہ چڑھا دیا ہے کہ اتفاق و اتحاد وہ چیز ہے کہ اس کے قائم کرنے کے لئے نمازیں قضا کر دی گئیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احزاب میں نمازیں قضا کر دی تھیں۔ سبحان اللہ! کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھانمتی کا کنبہ جوڑا، اول تو یہی بتلائیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کس سے اتحاد کر رہے تھے جو اتحاد کی وجہ سے نمازیں قضا ہوئیں، بلکہ وہاں تو عدم اتحاد اس کا سبب ہوا تھا۔ کفار سے مقابلہ اور لڑائی تھی۔ نہ کہ اتحاد کی گفتگو، اور اگر کوئی شخص اپنے اس اتحاد کو بھی مقابلہ میں داخل کرنا چاہے تو پھر وہ ثابت کرے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود فرصت کے نمازیں قضا کر دی تھیں۔ یا کفار نے آپ کو نماز پڑھنے کی مہلت ہی نہ دی تھی۔ احادیث و واقعات

میں صاف مذکور ہے کہ وہاں نماز کے قضا کرنے کا سبب یہ تھا کہ کفار نے آپ کو نماز کی مہلت نہ دی تھی کیونکہ مقابلے کے وقت مہلت اپنے قبضہ میں نہیں رہتی، بلکہ دونوں پر موقوف ہوتی ہے۔ اگر ایک مہلت لینا چاہے اور دوسرا مقابلے سے باز نہ آئے تو اس مہلت کا لینا بیکار ہے۔ پھر ایسی حالت میں نماز کیسے پڑھی جائے۔ بہرحال اس وقت قتال درپیش تھا اور ایسی حالت تھی کہ صلوٰۃ الخوف بھی نہ پڑھ سکتے تھے اس لئے آپ نے نماز قضا کی مگر آج کل جو اتحادی جلسوں اور ترقی قوموں کے مشوروں میں نمازیں قضا کی جاتی ہیں ان پر کون سا حملہ ہوتا ہے جس سے ان کو نماز کی مہلت نہیں ملتی، افسوس باتیں بنانے اور دور از کار ریزولیشنوں کے پاس کرنے میں تو نمازیں قضا ہوتی ہیں۔ اور ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات پر قیاس کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو کچھ تو شرم کرنی چاہیئے۔

اتحاد غلط طور پر

پس خوب سمجھ لو کہ یہ مسائل اور یہ دلائل سب غلط تھے۔ اور تماشا یہ کیا گیا کہ ان لوگوں کو اتحاد کا ایسا ہیضہ ہوا کہ کفار کو بھی بھائی بنایا اور انکی رعایت میں احکام شرعیہ کو چھوڑا گیا اور اس کی یہ مصلحت بیان کی جاتی ہے کہ اس سے اسلام کو کفار کی طرف انجذاب ہوگا۔ اور اگر ان کو بھائی نہ بنایا گیا تو اسلام سے بعید اور اجنبی رہیں گے۔

صاحبو! یہ خیال محض لغو تھا۔ اسلام تو ایسی حسین چیز ہے کہ کسی کی آنکھ میں کجی نہ ہو تو اس کا حسن ضرور اپنی طرف کھینچے گا۔ چاہیئے تم اس کو بھائی بھی نہ کہو بلکہ دشمن ہی کہو۔ ابوجہل کی آنکھ میں کجی تھی اس لئے اس کو ہدایت نہ ہوئی اور جس کی نگاہ میں کجی نہ تھی وہ کسی نہ کسی وقت اسلام کی طرف آئے اور پھر آئے حالانکہ عمر بھر اسلام سے عداوت ہی ظاہر کرتے رہتے تھے اور مسلمان بھی ہر موقع پر ان سے مقابلہ کرتے رہتے تھے۔ پس اسلام کو اپنی طرف منجذب کرنے کے لئے کسی کو بھائی بنانے کی ضرورت نہیں، وہ دشمن کو دشمن سمجھ کر بھی اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام نے دوسری قوموں کے حقوق کی بھی پوری رعایت کی ہے وہی حقوق اور وہی رعایت سب کے جذب کے لئے کافی ہے۔ پس میں یہ کبھی نہ کہوں گا کہ کفار ہمارے بھائی ہیں۔ ہاں یہ کہوں گا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں اور وہ ہمارے پڑوسی ہیں اور اسلام میں ہمسایہ کے بھی حقوق ہیں گو وہ کافر ہی ہو اور اگر ان کو بھائی کہا جاوے تو یہ بات چل نہیں سکتی نہ اس کو اس بیجا خوشامد کا یقین آسکتا ہے۔ اور یہ قرآن کے بھی بالکل خلاف ہے۔

کفار سے اتحاد

پس کفار سے ایسا اتحاد شرعاً جائز نہیں ہے جس میں احکام الٰہیہ کی بھی مخالفت کی جاوے۔ بھلا اگر ایسا اتحاد محمود ہوتا تو حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے (آپ کی عقل کامل پر تمام عالم کا اتفاق ہے) لا الٰہ الا اللہ کی تعلیم کیوں دی ہوتی جس سے تمام عالم میں تہلکہ مچ گیا اور کفار کہنے لگے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ اس تعلیم سے پہلے سب کفار آپ کے ساتھ متحد تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اتفاق کی بنیاد کو اکھاڑ ڈالا۔ کیونکہ کفار کے اس موافقت کی بنیاد کفر پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے کفر سے ہم کو نہیں روکا گیا۔ اسلئے خوش تھے اور ظاہر ہے کہ یہ بنیاد نہایت کمزور اور لچر بنیاد تھی۔ آپ نے اس کی نیویں نکالیں پھر نئی بنیاد ڈالکر اسپر عالی شان عمارت بنانے لگے مگر ہماری حالت اس وقت یہ ہو رہی ہے کہ ترقی و اتحاد بھی کرتے ہیں تو اس طریقہ پر جس پر کفار نے ترقی کی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر نہ ہماری ترقی ہے نہ اتحاد ہے حالانکہ ہم کو کفار کی چیزوں کی طرف تو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ممانعت ہے۔ حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہیں۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۔ (اور اپنی نگاہوں کو اس چیز کی طرف دراز نہ کیجئے جس کے ساتھ ہم نے کفار کی بعضوں جماعتوں کو تمتع دیا ہے جس میں زندگی دنیا کی رونق ہے تاکہ اس میں ہم ان کی آزمائش کریں اور آپ کے رب کی عطا بہتر ہے اور پائیدار ہے) اس میں تو کفار کے طریقہ ترقی کی طرف نگاہ اٹھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ آگے اپنی طرف سے ترقی کا طریقہ بتلاتے ہیں وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۔ اور اپنے اہل کو نماز کا حکم کیجیئے (اور خود بھی) اسپر جمے رہیئے۔ آپ سے ہم رزق نہیں مانگتے۔ رزق تو ہم خود ہی آپ کو دیں گے اور (اچھا) انجام تقویٰ ہی کا ہے) اس میں پابندی نماز اور تقویٰ کا حکم ہے اس کو کفار کی ترقی کے مقابلے میں بیان کرنا اس کی دلیل ہے کہ اسلامی ترقی کا طریقہ یہ ہے۔

لیجئے اللہ میاں نے بھی ملانوں ہی کے مذاق کی رعایت کی ہے۔ اب بتلاؤ! کیا اس قرآن کو مٹا دوگے؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ دو۔ اور نماز روزہ ہی کے ہو رہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ دنیا کو اصل مقصود نہ سمجھو، باقی بضرورت دین دنیا میں مشغول ہونے کا مضائقہ نہیں اس کی ایسی مثال ہے، جیسی کھانے کی ضرورت سے کنڈے جمع کئے جاتے ہیں۔ اور جب کوئی پوچھتا ہے کہ یہ کھانا کتنے میں تیار ہوا ہے تو اس کی فہرست میں کنڈے اور لکڑیاں بھی شمار ہوتی ہیں۔ (الاخوۃ ص ۱۵ تا ۲۳)

۶۹ - ترقی متعارف کا رد -

ترقی کا عنوان قرآن میں بھی آیا ہے اس لئے یہ عنوان ظاہر میں بھی بہت عمدہ ہے اس کی خوبی میں کلام نہیں ہو سکتا۔ مگر قرآن میں اس کو خیرات کے ساتھ مقید کیا گیا ہے کہ باہم خیرات میں ترقی کرو اب فیصلہ اسپر ہے کہ جس امر میں تم ترقی کی تعلیم دے رہے ہو وہ خیر ہے یا نہیں، تو ظاہر ہے کہ تم ترقی مال وحکومت کی تعلیم دے رہے ہو اور اس کا خیر ہونا تم شریعت سے ثابت نہیں کر سکتے -

شاید تم یہ کہو کہ قرآن میں ہے اِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ اور كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ِۨالْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ ۔ (الآیۃ) یہاں خیر سے مراد مال ہے ۔ لہٰذا ترقی مال بھی ترقی خیر ہوئی ۔ اس کا جواب یہ ہے ۔ "فاستبقوا الخیرات" میں خیر مطلق مراد ہے کہ خیر مطلق میں باہم سبقت کرو ، اور مال خیر مطلق نہیں بلکہ خیر مقید ہے جس کی خیریت کے لئے بہت سی شرطیں ہیں جن کی تم رعایت نہیں کرتے لہٰذا تم اپنی ترقی مالی کو ترقی خیر نہیں کہہ سکتے اور جس درجہ میں مال خیر ہے اس درجہ میں طلب مال سے ہم مانع نہیں ہیں بلکہ اس کو ہم بھی جائز بلکہ فرض کہتے ہیں کیونکہ حدیث میں ہے کسب الحلال فریضۃ قبل الفریضۃ -

آج کل کی ترقی کا حال

مگر تم ہی بتلاؤ کہ جیسی ترقی آج کل (یعنی زمانہ تحریکات میں) ہو رہی تھی کیا وہ خیر تھی اس میں شریعت سے تجاوز نہ تھا کہ مسلمانوں کو پنڈت کا لقب دیا گیا ۔ ہندوؤں کو مولانا کہا گیا قشقے لگائے گئے ۔ گائے کے گوشت کو ممنوع کیا گیا ۔ مسلمانوں سے قربانی کی گائیں چھینی گئیں ۔ اور ہندو کی نسبت کہا گیا کہ نبوت ختم نہ ہوئی ہوتی تو وہ نبی ہوتا (پھر جن لوگوں نے یہ باتیں کہیں ان سے قطع تعلق نہیں کیا گیا ۔ بلکہ ان کو بدستور لیڈر مانا گیا وغیرہ وغیرہ ، اگر اس صورت میں بھی تمہاری ترقی استباق فی الخیر کا مصداق تھی تو فرعون سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور کامیاب ہونا چاہیئے ۔ اس وقت لوگوں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی یہ کہتا کہ یہ کام شریعت کے خلاف ہے تو اس کو یہ جواب دیا جاتا کہ تم محض ملانے ہو ۔ تم کو سیاسات کی کچھ نہیں ۔ یہ وقت جائز اور ناجائز کے سوال کا نہیں ، اب تو جس طرح ہو ترقی حکومت ہونا چاہیئے ۔ افسوس ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ شریعت میں سلطنت خود مقصود نہیں بلکہ ملا پن کی مطلوب ہے اور سلطنت سے مقصود بھی ملا پن ہی کا پھیلانا ہے ۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ مگر لوگ اس کو مٹا رہے

تھے تو اس صورت میں اس کو ترقی خیر کون کہہ سکتا ہے ۔ پس حرص کا عنوان ترقی رکھ لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی مگر ان لوگوں نے تو اس عنوان سے اس کا عیب چھپانا چاہا ہے ۔ جب اس کا نام ترقی رکھ لیا تو اب وہ ان کے نزدیک مرض اور عیب ہی نہ رہا پھر وہ اس کا علاج کیا خاک کریں گے ؟

(علاج الحرص ص ۱۷)

۷۰ - توجہ الی اللہ کے معنیٰ -

اب سمجھیے کہ توجہ الی اللہ کیا چیز ہے ؟ بعض نے تو یہ سمجھا ہے کہ توجہ الی اللہ یہ ہے کہ نماز پڑھے روزہ رکھے اور احکام شرعیہ بجا لائے ۔ ان لوگوں نے ظاہری اعمال پر اکتفا کیا ۔ یہ لوگ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہونے کو ضروری نہیں سمجھتے مگر پھر وہ سوچتے ہیں کہ باوجود یہ کہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن اس میں برکت اور نورانیت کیوں نہیں پیدا ہوتی ۔ تقاضائے معصیت کیوں نہیں ہوتا ۔ چنانچہ آپ بہت سے نمازیوں کو گناہ میں مبتلا پائیں گے اور بعض نے کہا کہ توجہ الی اللہ کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ دل سے خدا کی طرف متوجہ ہو ، یہ لوگ ذکر وشغل اور مراقبات ہی کو لے بیٹھے ۔ انہوں نے نماز روزہ اور تلاوت قرآن اور نظر بد کا بچانا وغیرہ سب چھوڑ دیا ۔ مگر ان کو بھی برکت اور نورانیت حاصل نہ ہوئی کیونکہ یہ لوگ بھی معاصی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور دل میں گناہوں کا تقاضائے شدید پاتے ہیں ۔ تو سنو ! کہ توجہ الی اللہ کی حقیقت تو یہی ہے کہ خدا کی طرف دل سے متوجہ ہو ، مگر ہر حقیقت کی ایک صورت بھی ہوتی ہے اور توجہ الی اللہ کی صورت وہی ہے جو شریعت نے بتلائی ہے پس دونوں کو جمع کرنا چاہیئے کہ دل سے حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہو اور ظاہر سے اعمال شرعیہ کے پابند رہو ۔ طاعات کو بجا لاؤ اور معاصی سے بچنے کا اہتمام کرو ، نگاہ کو روکو ، اور نامحرموں کی باتیں بھی نہ سنو ۔ اس کے بعد بھی اگر نورانیت نہ ہو تو ہم پر ہنسنا ۔ اس وقت میں وہی کہتا ہوں جو ایک صاحب طریق نے کہا ہے ؎

چشم بند و لب بہ بند و گوش بند !
گر نہ بینی نور حق برما بخند !

اس وقت یہ غلطی ہو رہی ہے کہ بعض تو اعمال ظاہر کے تارک ہیں اور اعمال باطنہ کے تارک ہیں ۔ اس لئے توجہ الی اللہ کامل طور سے حاصل نہیں ہوتی ۔ دونوں کو جمع کرنا چاہیئے ۔

(علاج الحرص ص ۳۰)

۷۱ - پردہ کا عقلی ثبوت

آج کل بعض ناعاقبت اندیش پردہ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ پردہ کے توڑنے میں قطع نظر خلاف شرع اور گناہ ہونے کے اتنی خرابیاں ہیں کہ آج جو عقلاء پردہ کی مخالفت کرتے اور پردہ اٹھا دینے کی کوشش کرتے ہیں ان خرابیوں کو دیکھ کر بعد میں خود ہی یہ تجویز کریں گے کہ پردہ ضرور ہونا چاہیئے مگر اس وقت بات قابو سے نکل چکی ہوگی اب تو بنی بنائی بات ہے اس کو نہیں بگاڑنا چاہیئے۔ پھر پچتائیں گے اور کچھ بھی نہ ہوسکے گا۔ آج کل ایسا مذاق بگڑ گیا ہے کہ کوئی پردہ کو خلاف فطرت کہتا ہے۔ کوئی قید اور حبسِ بیجا کہتا ہے۔

ایک مسلمان انجنیئر تھے۔ ان سے ایک پادری انجنیئر نے کہا کہ مسلمانوں کا مذہب بہت اچھا ہے اس میں سب خوبیاں ہیں مگر عورتوں کو قید میں رکھا جاتا ہے۔ مسلمان انجنیئر نے کہا کہاں ہم نے تو کسی مسلمان عورت کو قید میں نہیں دیکھا۔ کہا وہی قید ہے جس کا نام تم نے پردہ رکھا ہے۔ تو ان مسلمان انجنیر صاحب نے پادری سے کہا کہ پہلے آپ یہ بتلایئے کہ قید کس کو کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قید حبس خلافِ طبع کو کہتے ہیں۔ اور جو حبس خلاف طبع نہ ہو اس کو قید ہرگز نہ کہیں گے ورنہ پاخانہ میں جو آدمی پردہ کر کے بیٹھتا ہے اس کو بھی قید کہنا چاہیئے۔ کیونکہ پاخانہ میں آدمی تمام آدمیوں کی نگاہوں سے چھپ جاتا ہے۔ سب سے الگ ہو جاتا ہے مگر اس کو کوئی نہیں کہتا کہ آج ہم بھی اتنی دیر قید میں رہے۔ اور فرض کرو اگر اس پاخانہ میں کسی کو بلا ضرورت بند کر دیا جائے کہ باہر سے زنجیر لگا دیں اور ایک پہرہ دار کھڑا کر دیا جائے اور اس سے کہدیا جائے کہ خبردار! یہ آدمی یہاں سے نکلنے نہ پاوے تو اس صورت میں بیشک یہ حبس خلاف طبع ہوگا اور اس کو ضرور قید کہیں گے اور اس صورت میں بند کرنے والے پر حبس بیجا کا مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ بتلایئے ان دونوں صورتوں میں فرق کیا ہے؟ فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں حبس خلاف طبع نہیں اور دوسری میں خلاف طبع ہے۔

پس ثابت ہوا کہ مطلق حبس کو قید نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ حبس خلاف طبع کو قید کہتے ہیں پس آپ کو پہلے یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں جو پردہ میں رہتی ہیں وہ انکی طبیعت کے موافق ہے یا خلاف اس کے بعد یہ کہنے کا حق تھا کہ پردہ قید ہے یا نہیں، میں آپکو مطلع کرتا ہوں کہ پردہ مسلمان عورتوں کے خلاف طبع نہیں ہے کیونکہ مسلمان عورتوں کیلئے حیاء

امر طبعی ہے۔ لہٰذا پردہ حبس موافق طبع ہوا اور اس کو قید کہنا غلط ہے۔ ان کی حیاء کا مقتضا یہی ہے کہ پردہ میں مستور رہیں بلکہ اگر ان کو باہر پھرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ خلاف طبع ہوگا۔ اور اس کو قید کہنا چاہیئے۔ (کساء النساء صہ ۵۹)

۷۲ - کیا وجہ ہے کہ اعمال آخرت میں رغبت نہیں ہوتی۔

اعمال میں کوتاہی اور بے رغبتی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اعمال میں اور ان کی اجزاء میں کچھ تعلق اور ارتباط نہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ ان اعمال پر جو جزائیں ملتی ہیں ان میں اور اعمال میں باہم کوئی علاقہ نہیں، ایسا سمجھئے جیسے اس دنیا کے اسباب اور مسببات میں علاقہ ہے۔ مثلاً سہارنپور سے ریل میں سوار ہو کر نینی تال چلے تو اس لین میں اور نینی تال میں یہ علاقہ ہے کہ پہلے بریلی پہونچے پھر بریلی سے چل کر کاٹھ گودام کا اسٹیشن ملتا ہے وہاں کچھ دیر کے بعد اور سواری ملتی ہے بہرحال نینی تال اور ان اسباب میں ایک قوی علاقہ ہے تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ کی وجہ سے کشش ہوتی ہے اور یہاں علاقہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور سمجھ میں اسلئے نہیں آتا کہ نظر نہیں آتا۔ اس لئے دل کی کشش نہیں ہوتی یعنی ابھرتی نہیں طبیعت جیسی کے لئے ابھرنی چاہیئے۔ بعنوان دیگر، میری مراد یہ ہے کہ اس مقصود کے لئے طبیعت اس واسطے نہیں ابھرتی کہ خود اس مقصود کو اپنے اختیار میں نہیں سمجھتے اور خود اس واسطے نہیں سمجھتے کہ اسباب اور مقصود میں یعنی اعمال میں اور جزاؤں میں کچھ علاقہ نہیں سمجھتے ورنہ اگر علاقے سمجھتے تو چونکہ اسباب اختیاری ہیں اس لئے اس حیثیت سے مقصود کو بھی اختیاری سمجھتے۔ جب اختیاری نہیں سمجھتے تو طبیعت ابھرتی بھی نہیں کیونکہ طبیعت اسی کام میں ابھرتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار میں سمجھتا ہے چنانچہ یہی بات ہے کہ عامی کو کبھی سلطنت کی ہوس بھی نہیں ہوتی اس کو کبھی اس کو وسوسہ بھی نہیں آتا کہ میں بادشاہ ہو جاؤں، وہ کبھی اس پر غور ہی نہیں کرتا کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرو، بادشاہ بنو، محل میں رہو، مثلاً ایک رئیس سے پوچھا کہ بادشاہ یوں محل میں رہا کرتے ہیں یوں ان سازو سامان ہوتے ہیں یوں حشم و خدم ہوتے ہیں۔ خیر ان عجائب امور کو سنکر چاہے اس کا جی خوش ہونے لگے لیکن یہ ہرگز نہ ہوگا۔ اس کی طبیعت میں گدگدی اور دھڑ دھڑی پیدا ہو کہ کسی ترکیب سے سلطنت حاصل کرنی چاہیئے لاؤ سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم کریں،

یہ بھی سمجھتا ہے کہ اگر کسی سے پوچھونگا بھی تو وہ ڈانٹ دے گا کہ ابے تو پاگل ہوگیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ جوتیاں کھا دے گا ـــ سبحان اللہ ! رہیں جھونپڑوں میں خواب دیکھیں محلوں کا۔

غرض بادشاہوں کے قصے سنکر وہ سلطنت حاصل کرنے کا طریق معلوم نہ کرے گا۔ اور اگر معلوم بھی کرلے تو کیا ہے۔ وہ اتنے بعید ہیں کہ وہ تو بیچارہ کا طائر وہم بھی وہاں نہیں پہونچ سکتا۔ اب سر پر ٹوکرا رکھنے والا اور گوہ اٹھانے والا بھی بادشاہوں کے قصے سنتا ہے۔ لیکن کیا کبھی اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آتا ہے کہ لاؤ میں بھی بادشاہ بننے کی کوشش کردں۔ کس سے پوچھوں کہ سلطنت کیونکر حاصل ہوتی ہے۔ اگر معلوم ہوا کہ لڑنے سے حاصل ہوتی ہے تو کیا مشکل ہے ہم بھی فوج اکٹھا کریں گے۔ ہم بھی لڑیں گے۔ میں پوچھتا ہوں کیا اس کے بھی ذہن میں کبھی یہ خیالات آتے ہیں ؟ کبھی نہیں اس واسطے کہ وہ اسباب ہی اختیار میں نہیں تو پھر کتنا ہی بڑا مقصود کیوں نہ ہو۔ طبیعت ابھرتی ہی نہیں۔ بخلاف اس کے نینی تال کا حال سنا تو طبیعت میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے فکر ہوتی ہے کہ بس پچاس روپے پاس ہوں تو وہاں پہونچیں۔ اور اگر ہوں بھی پاس، بس پھر کیا ہے۔ پھر تو سمجھتا ہے کہ وہاں پہونچنا گویا ہر وقت اختیار میں ہے اور سوچتا ہے کہ جب اختیار میں ہے تو پھر کیوں نہ حاصل کیا جاوے اس مقصود کو۔ چنانچہ نہایت شوق کے ساتھ وہاں پہونچنے کا فوراً اہتمام کرنے لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو جس مقصود کے اسباب کو انسان اختیاری نہیں سمجھتا ہو لیکن اسباب اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہو تب بھی حرکت نہیں ہوتی۔ اس حالت میں اسباب کی طرف حرکت نہ ہونیکی وجہ اسباب ہیں اور مقصود میں تعلق معلوم نہ ہونا ہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مقصود کی طرف حرکت نہ ہونے کی کہ ان اسباب اور مقصود میں چونکہ تعلق معلوم نہیں اس لئے ان اسباب پر اس مقصود کے ترتیب کا معتقد نہیں اور اس معتقد نہ ہونے سے باوجود اسباب کے اختیاری سمجھنے کے بھی اسباب کو اختیار نہیں کرتا اس واسطے کہ مقصود اگر اختیار میں ہے تو بواسطہ اسباب ہی کے تو اختیار میں ہے تو گو اسباب اختیار میں ہیں لیکن چونکہ اسباب اور مقصود میں تعلق نہیں اس لئے اسباب کے اختیار کرنے کا حال طاری نہیں ہوا اس کو جس طرح اسباب کے اختیاری ہونے کا علم ہے۔ اسی طرح اگر یہ بھی معلوم ہوتا کہ اگر اسباب اور مقصود میں یہ تعلق ہے تب طبیعت ابھرتی اور شوق پیدا ہوتا۔ اب وہ تعلق تو چونکہ ذہن میں حاضر نہیں اس لئے اسباب اختیار کرنے میں جی لگتا نہیں ہے۔ یہ اطمینان نہیں ہے کہ اسباب اختیار کرنے سے مقصود ضرور حاصل ہو ہی جائے گا پھر جب مقصود ہی کو اختیاری نہیں سمجھتا تو اس کے اسباب اختیار کرنے کی طرف بھی حرکت نہیں ہوتی۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی بطور مثال کے، تو اب یہ سمجھئے کہ نعمائے آخرت اور جنت کی طرف جو طبیعت نہیں ابھرتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اعمال میں اور مقصود میں جو واقعی علاقہ ہے وہ نہیں سمجھتے یعنی ایسا علاقہ جیسا آگ جلانے اور کھانا پکنے میں ایسا علاقہ جیسے پانی پینے اور پیاس کے بجھنے میں ایسا علاقہ جیسے ہمسر خاندان میں پیام دینے اور عورت کے گھر آجانے میں۔ غرض ایسا علاقہ نہیں سمجھتے اعمال صالحہ میں اور جنت کے حاصل ہونے میں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص قریب قریب یہ سمجھتا ہے کہ جنت میں داخل ہونا اختیاری نہیں۔ ہرگز ہرگز ذہن اس کی طرف نہیں جاتا کہ اعمال صالحہ پر جنت ضرور ہی مل جاوے گی۔ ایسا سمجھتے ہیں جنت کو کہ اعمال صالحہ پر بس محض اتفاقاً ہی مرتب ہوجاتی ہے جیسے کسی کو اتفاق سے سلطنت مل جائے مثلاً کہیں اتفاقاً ہما سر پر بیٹھ گیا اس لئے بادشاہت مل گئی۔ چنانچہ پرانے زمانہ کے ایسے ہی افسانے ہیں کہ کسی جگہ کا بادشاہ مرگیا اس کے کوئی اولاد بھی نہیں۔ اس لئے اس میں اختلاف ہوا کہ کس کو بادشاہ بنایا جاوے۔ اس کے متعلق پہلے یہ دستور تھا کہ ہما اڑاتے تھے وہ جس کے سر پر بیٹھ جاتا اس کو بادشاہ بناتے تھے اور کوئی فقیر بھی اسوقت ہوتا اور اس کے سر پر ہما بیٹھ جاتا اسی کو بادشاہ بنا دیتے چنانچہ ہما اڑایا گیا۔ جانور کو کیا عقل اتفاق سے ایک فقیر ہی کے سر پر جا بیٹھا۔ بس اسی کو تخت پر بیٹھا دیا گیا۔ اب اگر کوئی فقیر یہی حوصلہ کرنے لگے اور وہاں پہونچنے کا اہتمام کرے کہ شاید ہما میرے ہی سر پر بیٹھ جائے اور میں بادشاہ ہوجاؤں تو سب اس کو احمق بنائیں گے کہ یہ کیا لغو حرکت ہے۔ یعنی محض ایک موہوم امید پر کہ شاید ہما میرے ہی سر پر آبیٹھے، اتنا لمبا سفر کرنا اور جو نہ بیٹھا پھر اتنا لمبا سفر بھی کیا۔ اور وہاں سفر کے بھی بوم ہوئے یعنی ہما تو کیا سر پر بیٹھتا سب الو بتاتے کہ بڑا گدھا ہے فلانا فقیر۔ اسپر قہقہہ لگادیں کے کہ بالکل الو ہی ہے بھلا تیرا ہی تو منتظر ہے ہما کہ کب وہ آئے اور کب میں اس کے سر پر بیٹھوں الو کہیں کا۔ ارے کسی کا الو سیدھا کرنے کے لئے ہما کیوں ٹیڑھا ہونے لگا کیونکہ یہی ٹیڑھا ہونا ہے اس کا کہ نااہل کے سر پر بیٹھے۔ پھر جب یہ حال ہے تو بھلا اسپر کوئی کیا سفر کرے۔ تو جیسے ہما کا سر پر بیٹھنا غیر اختیاری سمجھا جاتا ہے اسی طرح جنت کا حاصل ہونا بھی لوگ غیر اختیاری سمجھتے ہیں۔ واقعی ٹٹول کر دیکھ لیجئے اپنے وجدان کو اکثر کا یہی قاعدہ ہے کہ جنت کا حاصل ہونا کسی کے اختیار ہی میں نہیں۔ حضرت میں کہتا ہوں اگر جنت اختیار میں نہیں تو حق تعالیٰ یہ کیوں ارشاد فرماتے ہیں۔ **وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنۃ**۔ دوڑو مغفرت اور جنت کی طرف، تو کیا اللہ میاں اندھی کوٹھری میں دوڑا کر سر پھڑواتے ہیں۔ پھر حکم بھی دوڑ کر چلنے کا فرمایا تو معلوم ہوا کہ سڑک بالکل

صاف ہے جو شخص اعمال صالحہ کرے گا۔ بشرطیکہ ایمان بھی ہو، واللہ العظیم ثم واللہ العظیم ثم واللہ العظیم وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ تو عجب ہے کہ یہ شخص گویا تکذیب کرتا ہے نصوص کی۔ اور یہ خرابی کی ہے جاہل واعظوں نے، انہوں نے بس یہ حدیث بیان کر دی کہ ایک شخص تھا جس نے ساری عبادت گذاردی اور جنت کے کام کئے لیکن اخیر میں دوزخی ہوگیا حالانکہ اس جاہل واعظ نے حدیث کو سمجھا ہی نہیں۔ حدیث میں جو آیا ہے اس کا سبب بھی کسی عمل اختیاری ہی کا صدور ہے۔ (آثار المربع ص۹ تا ۱۲)

۷۳۔ عالم مثال اور عذاب و ثواب قبر کا اثبات

اور عالمِ مثال کا اثبات کرتا ہوں۔ سو سمجھ لیجئے کہ یہ ثابت ہے اشاراتِ نصوص سے۔ اور اشارات تو میں نے احتیاطاً کہہ دیا ہے ورنہ وہ اشارات بمنزلہ صراحت کے ہیں تو گویا بالتصریح یہ بات ثابت ہے کہ علاوہ شہادت یعنی دنیا کے اور عالم غیب یعنی آخرت کے ان دونوں کے درمیان میں ایک اور بھی عالم ہے جس کو عالم مثال کہتے ہیں جو من وجہ مشابہ ہے عالم شہادت کے اور من وجہ مشابہ ہے عالم غیب کے یعنی وہ برزخ ہے درمیان دنیا اور آخرت کے اور اس عالم کے ماننے سے ہزاروں اشکالات قرآن وحدیث کے حل ہو جاتے ہیں۔

مثلاً حدیث میں ہے اور یہ کام کی بات ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ قبر میں اس طرح سے عذاب ہوگا یا ثواب ہوگا مثلاً عذاب کی ایک صورت یہ بھی ہوگی کہ زمین مل جائے گی اور صاحب قبر کو دبا لے گی۔ اسپر اشکال وارد ہوتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا فصل لاش اور قبر کی دیواروں میں مردہ کو رکھتے وقت ہوتا ہے وہی باقی رہتا ہے لاش دبتی دباتی کچھ بھی نہیں ویسی کی ویسی رکھی رہتی ہے۔ تو یہ صورت عذاب قبر کی جو حدیث میں آئی ہے ظاہر ہے کہ دنیا کے متعلق تو ہے نہیں کیونکہ مشاہدہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔

یہ اشکال اس وجہ سے اور بھی قوی ہوگیا کہ لوگوں نے اس کو دنیا ہی کے متعلق سمجھ لیا ہے حالانکہ اگر دنیا کے متعلق ہوتا تو اس کے آثار کا نظر آنا بھی ضروری تھا۔ اور آخرت کے متعلق سمجھا جائے تو اول تو آخرت میں وہ زمین نہیں جو لفظ زمین سے متبادر ہے۔ دوسرے یہ کہ آخرت میں اگر وہ پہونچ جاوے تو پھر وہاں وہی ٹھکانے ہیں جنت یا دوزخ۔ اور داخل ہونے کے

بعد جنت سے تو کسی کا نکلنا ممکن نہیں اور دوزخ سے بھی سب کا نکلنا ممکن نہیں۔ اور حشر ہوگا جنت اور دوزخ سے باہر تو معلوم ہوا کہ ابھی جنت یا دوزخ میں گیا ہی نہیں۔ پھر حدیث کے کیا معنی! تو اول نظر میں تو کسی کو یہی شبہ ہو سکتا ہے کہ جو ملاحدہ اور اہل سائنس کہتے ہیں وہی ٹھیک ہے چنانچہ ملاحدہ اور بعض اہل سائنس جو ایمان لائے ان کا بھی مذہب یہی رہا کہ یہ سب مثالیں ہیں اور تشبیہیں ہیں۔ اور مطلب ان مثالوں کے دینے سے یہ ہے کہ ایسی حالت ہوتی ہے یعنی بعض مشابہ ان حالتوں کے ہوتی ہے۔ واقع میں یہ حالتیں پیش نہیں آتیں۔ تو اپنے نزدیک گویا یہ بہت بڑی دوڑ دوڑے۔

حاصل اس تقریر کا یہ ہوا کہ وہ لوگ محض روحانی عذاب وثواب کے قائل ہو گئے اور جسمانی کے منکر ہو گئے۔

اسی طرح حدیث شریف میں جو ہے القبر روضۃ من ریاض الجنۃ او حفرۃ من حفر النار۔ یعنی قبر یا جنت کا ٹکڑا ہوتی ہے یا دوزخ کا گڈھا۔ تو وہ لوگ اسپر کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں قبر میں کہ یہاں نہ تو پھول ہیں جنت کے نہ آگ ہے دوزخ کی پھر اپنے ظاہری معنوں پر قبر دوزخ کا گڑھا یا جنت کا ٹکڑا کیونکر ہو سکتی ہے۔ غرض یہاں قبر کی جنت و دوزخ میں تو یہ اشکال ہے، رہی آخرت سو وہاں کی دوزخ و جنت میں وہ اشکال ہے جو میں نے پہلے عرض کیا۔

بہرحال یہ اشکال حل نہیں ہو سکتا جب تک تیسرے عالم کے قائل نہ ہوں۔ یعنی عالم برزخ کے، جس کو عالم مثال بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مشابہ اس عالم کے بھی ہے یعنی باعتبار آخرت ہے تو گویا کہ وہ دنیا ہے۔ اور باعتبار دنیا کے گویا وہ آخرت ہے تو وہ ایسا عالم ہے جیسا کہ باغ کا پھاٹک کہ بہ نسبت اندرونی حصہ باغ کے، تو گویا وہ باغ نہیں ہے۔ لیکن بہ نسبت خارج حصہ باغ کے گویا کہ وہ باغ ہے۔ یا جیسے حوالات کہ بہ نسبت گھر کے تو وہ جیل خانہ ہے مگر بہ نسبت جیل خانہ کے پھر گھر ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے عالم مثال کو دنیا کا بھی نمونہ بنایا ہے۔

تو جس وقت انسان مرتا ہے پہلے اس عالم مثال ہی میں جاتا ہے۔ وہاں ایک آسمان بھی ہے مشابہ دنیا کے آسمان کے اور ایک زمین بھی ہے مشابہ دنیا کی زمین کے۔ اور ایک جسم بھی ہے مشابہ اس جسم کے لیکن وہ بھی ہے جسم ہی۔ تو مرنے کے بعد تو روح کے لئے ایک جسم مثال ہوگا اور آخرت میں جو جسم ہوگا وہ یہی ہوگا جو دنیا میں ہے۔

غرض یہ ایمان ہے ہمارا کہ حشر روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی یعنی یہی جسم جو ہم اب

لئے بیٹھے ہیں اور جو گل سڑ کر خاک ہو جائے گا اسی کو حق تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے پھر تازہ بنا کر محشور فرمائیں گے۔ لیکن وہاں اس جسم کی خاصیت بدل جائے گی یعنی اب تو یہ خاصیت ہے کہ جو ہم کھاتے پیتے ہیں اس کا پیشاب پاخانہ بنتا ہے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں یہاں تک کہ ایک دن مر کر فنا ہو جانا ہے وہاں گویا ابدی اور خالد ہو جائے گا۔

غرض ایک تو جسم یہاں ہے اور ایک جسم ہے عالم مثال میں اور وہ مشابہ ہے اس جسم کے یہ جسم بعینہٖ نہیں تو عالم مثال میں بدن بھی مثالی ہے وہاں کی جنت بھی مثالی ہے دوزخ بھی مثالی ہے۔ بس اس عالم مثال ہی کا نام قبر ہے۔ اب سب اشکال رفع ہو گئے۔ کیا معنیٰ کہ قبر سے مراد یہ محسوس گڑھا نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کو بھیڑیا کھا گیا یا کوئی سمندر میں غرق ہو گیا تو اس صورت میں چونکہ وہ زمین میں دفن نہیں ہوا اسلئے اس کو چاہیئے کہ قبر کا عذاب ہی نہ ہو۔ لیکن اب اشکال ہی نہ رہا۔ کیونکہ وہ عالم مثال ہے وہیں اس کو عذاب قبر بھی ہو جائے گا۔ اشکال تو جب ہوتا جب قبر سے مراد یہ گڑھا ہوتا جس میں لاش دفن کی جاتی ہے حالانکہ اصطلاح شریعت میں قبر گڑھے کو کہتے ہی نہیں بلکہ عالم مثال کو کہتے ہیں قبر اور وہاں پہونچنا کسی حال میں منتفی نہیں، خواہ مردہ دفن ہو یا نہ ہو۔ اور اس عالم مثال کے نہ جاننے ہی کی وجہ سے یہ بھی کہتے ہیں، عوام کی قبر ذرا بڑی رکھنی چاہیئے تاکہ مردہ کو بیٹھنے میں تکلیف نہ ہو، تو معلوم ہوتا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسی قبر کے اندر مردہ کو بیٹھایا جاتا ہو گا۔ تو بس پھر کیا ہے اگر اپنے دشمن کو ستانا ہو تو اس کی قبر ذرا تنگ بنا دی جاوے تاکہ ہرگز بھی اسے دشمن کے لئے تمنا کرتے ہیں کہ مر کر بھی مصیبت سے نہ بچے تو اچھا ہے حضرت یہ جو وسیع قبر شریعت نے تجویز کی ہے یہ اس بنا پر تھوڑا ہی ہے کہ اس کے اندر مردہ کو بیٹھایا جائے گا۔ جیسے آپ اس وقت بیٹھے ہیں بلکہ یہ تو محض اکرام اور عزت ہے مومن کی کہ اس کو مر کر بھی بیکار نہ سمجھے گیا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے مرتبے کا لحاظ کیا اور ہر طرح اس کا اکرام کیا۔ یہ نہیں کہ وبال تھا ٹال دیا۔ بلکہ یہ حکم ہوا کہ اس کی اس وقت بھی خاطر و تواضع کرو۔ قبر ایسی بناؤ کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو ویسی ہی جگہ اس کے لئے تجویز کرتے کپڑا ایسا پہناؤ جیسا کہ وہ زندگی میں پہنتا۔ یعنی ویسا ہی صفائی ہو خوشبو میں بھی لگاؤ۔ نہلاؤ دھلاؤ بھی، غرض بنا سنوار کر عزت کے ساتھ اس کو رخصت کرو، اور واقعی جیسا مسلمانوں میں مردہ کا اکرام ہوتا ہے کسی قوم میں نہیں ہوتا، اور عیسائیوں میں بھی بہت اکرام ہوتا ہے کسی قوم " غلو بہت زیادہ ہے یہاں تک کہ بیٹ بھی کستے ہیں۔ بوٹ بھی، پیٹی بھی غرض پوری وردی پہناتے ہیں۔ گویا وہاں جا کر بھی صاحب بہادر پہرہ ہی دیں گے۔

غرض عیسائیوں کے یہاں تو اکرام میں غلو ہے اور ہندوؤں کے یہاں بالکل بھی اکرام نہیں بلکہ اور الٹی بے حرمتی ہے۔ یہاں تک کہ بیچارے کا سر بھی پھوڑتے ہیں۔ خیر وہ بیچارہ تو نہیں ہے تو واقعی سر پھوڑے جانے کا مستحق۔ بہرحال اسلام میں اعتدال ہے تو وہ عالم عالم مثال ہے جہاں مرنے کے بعد انسان اول پہونچتا ہے اور وہ مشابہ کچھ اس عالم کے ہے اور کچھ مشابہ عالم آخرت کے ہے وہیں اس کو فرشتے بٹھلاتے ہیں وہیں اس سے سوالات کرتے ہیں وہیں کی زمین اس کو دباتی ہے وہیں اس کو عذاب و ثواب ہوتا ہے وہ عالم یہی ہے جس کو حدیثوں میں قبر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور لو میں اب تمہیں کچھ اس کا پتہ بھی بتائے دیتا ہوں جس سے یہی اس کی کچھ حقیقت سمجھ میں آجاوے۔ اور وہ عالم کچھ کچھ خواب میں منکشف ہوتا ہے لیکن ایک تو خواب ہوتا ہے سچا اور ایک ہوتا ہے محض خیال، تو خواب سچا ہوتا ہے اس میں کچھ کچھ انکشاف اس عالم کا ہوتا ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ خواب میں حقیقت اس عالم کی مغلوب ہوتی ہے کیونکہ اس میں آمیزش اس خیال کی بھی ہوتی ہے اور وہاں بالکل حقیقت ہی حقیقت ہو گی۔ وہ حقیقت اصلیہ بھی عالم آخرت کی حقیقت اصلیہ کے اعتبار سے تو بمنزلہ خواب ہی کے ہے بلکہ خواب میں جو حقیقت عالم مثال منکشف ہوتی ہے وہ بمقابلہ مثال کی حقیقت اصلیہ کے اتنی ضعیف نہیں ہوتی ہے جبتی عالم مثال کی حقیقت اصلیہ بمقام عالم آخرت کی حقیقت اصلیہ کے ضعیف ہے وہ اس سے بھی ضعیف تر ہے۔ تو خواب میں اگر کوئی یہ دیکھے کہ مجھے سانپ نے کاٹا تو اب وہ خواب ہی میں بھاگتا بھی ہے۔ چلاتا بھی چیختا بھی ہے چلاتا بھی ہے۔ اب کوئی اس سے کہے کہ ارے تو برابر بستر پر پڑا رہا ہے نہ تجھے کسی سانپ نے کاٹا نہ تو بھاگا نہ چلایا، کیوں خواہ مخواہ جھوٹ بول رہا ہے تو کہہ سکتا ہے مگر چونکہ یہ امر خواب میں ہر شخص کو واقع ہوتا ہے اور عالم مثال منکشف ہوتا ہے اس لئے اس کی کوئی تکذیب نہیں کرتا اور شارع علیہ السلام اس کی خبر دیں تو وہاں تکذیب کرتا ہے۔ حیرت ہے تو عالم مثال میں ہر چیز کا نمونہ موجود ہے، یعنی جتنی چیزیں ہیں موجودات حقیقۃ وہ سب وہاں موجود ہیں۔

ایسی مثال ہے جیسے آئینہ کہ اس میں بھی اپنی شبیہ نظر آتی ہے لیکن جس طرح آئینہ میں بھی ہمیشہ شکل بالکل مشابہ نظر نہیں آتی، یعنی آپ نے دیکھا ہو گا کہ کسی آئینہ میں تو بڑا لمبا چہرہ نظر آتا ہے کسی میں بہت چوڑا اور ایسا بڑا کہ خود ہی تھپڑ مارنے کو جی چاہے۔ اسی طرح سیاہ آئینہ میں سیاہ صورت نظر آتی ہے حالانکہ آپ نے چہرہ پر کالک نہیں لگا رکھی ہے اور سرخ آئینہ میں سرخ صورت نظر آتی ہے حالانکہ آپ نے چہرہ پر کوئی سرخ چیز نہیں مل رکھی، تو جسطرح

یہاں جو چیزیں آئینہ میں نظر آتی ہیں وہ من کل الوجوہ مشابہت نہیں رکھتیں اصل کے ساتھ، بلکہ جو آئینہ سچا ہوتا ہے وہ بالکل سچا نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ کم از کم اتنا فرق تو ضرور ہوگا کہ آپ تو مثلاً بیٹھے ہیں مغرب میں لیکن آئینہ میں آپ نظر آویں گے مشرق میں۔ تو دیکھئے کہاں رہی مشابہت من کل الوجوہ۔

غرض یہ جو آئینہ میں عکس نظر آتا ہے یہ محض ایک مثال ہے۔ اصل صورت کی۔ یعنی اس کو ایک گونہ مناسبت ہے اصل صورت کے ساتھ تو جیسے آئینہ میں سب چیزیں آتی ہیں اسی طرح عالم مثال میں اور اس عالم میں جو صورتیں مشابہ ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو مماثلت نہ ہوتی ہے اور بعض میں مناسبت جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ وہ مناسبت بعض اوقات جلی ہوتی ہے اور بعض اوقات خفی۔ مثلاً ہم نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص کے لڑکا پیدا ہوا ہے اور بعد میں سن بھی لیا کہ واقعی اس کے لڑکا پیدا ہوگیا تو یہاں تو باہم مناسبت قوی ہے اور جلی ہے جس کو مماثلت کہنا چاہیئے اور کبھی یہ مناسبت قوی نہیں ہوتی بلکہ ضعیف اور خفی ہوتی ہے جیسے میں نے دیوبند میں خواب دیکھا کہ منشی سراج الحق ایک پلنگ پر بیٹھے ہیں لیکن وہ دو ہیں یعنی سرہانے بھی وہی بیٹھے ہیں اور پائینتی بھی وہی بیٹھے ہیں۔ غرض یہ دیکھا کہ دو سراج الحق ہیں۔ حضرت مولینا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے یہ خواب بیان کیا تو مولانا نے فی البدیہ فرمایا کہ انشاء اللہ ان کے لڑکا پیدا ہوگا ہوگا کیونکہ اولاد جو ہے وہ باپ کا وجود ثانی ہے چنانچہ ان کے گھر میں امید تھی لڑکا ہی پیدا ہوا۔ یہ مناسبت خفی تھی۔ یعنی بیٹے کو باپ کی شکل میں دیکھا یہ مماثلت کو نہیں کہی جاسکتی ہاں مناسبت ہے۔ اب جس کو اس عالم مثال کی وجوہ مناسبت کا زیادہ علم ہے وہی معتبر ہوتا ہے اور جس کو جتنا زیادہ اس مناسبت کا علم ہوگا اتنا ہی وہ اعلیٰ درجہ کا معتبر ہوگا۔ کیونکہ تعبیر خواب کا حاصل یہ ہے کہ معبر صورت مرئیہ سے صورت مثالیہ کی عبور کرتا ہے تو یہ معبر صورت مناسبہ کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ کس حقیقت کی صورت ہے اور یہ کوئی بزرگی کی بات نہیں۔ بلکہ محض فراست ہے۔ چنانچہ بعض کفار بھی نہایت صحیح تعبیر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابو جہل بھی بڑا معبر تھا تو اب کیا اس کو بھی بزرگ کہیں گے۔

(آثار المربع ص۳۸ تا ۴۳)

---

۴۷ - اس اعتراض کا جواب کہ عالم آخرت محض خیالی ہی ہے۔

یہ لوگ عالم مثال کے ایسے قائل ہوئے کہ سرے سے آخرت ہی کو اڑا دیا۔ یعنی آخرت کی حقیقت ہی یہ بیان کی کہ آخرت یہی تمثلات ہیں وہاں مادیات نہیں، یعنی جیسے دنیا عالم مادی ہے اور عالم آخرت ان کے نزدیک ایسا نہیں ہے وہ غیر مادی ہے حالانکہ اہل حق کے نزدیک آخرت بھی عالم مادی ہے اور وہ غلط کار لوگ کہتے ہیں کہ آخرت عالم مادی نہیں ہے بلکہ محض تخیل ہوگا۔ لیکن ایسا قوی تخیل ہوگا کہ یوں معلوم ہوگا جیسے مادیات ہوں۔ بس ایسا عالم ہوگا جیسے خواب میں ہوتا ہے کہ سانپ کے کاٹنے کی تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔ انسان ڈرتا بھی ہے بھاگتا بھی ہے، چیختا بھی ہے، چلاتا بھی ہے لیکن واقع میں نہ کوئی سانپ ہوتا ہے نہ وہ کاٹتا ہے نہ کچھ ہوتا ہے وہ عذاب قبر کے بھی اسی طور پر قائل ہیں کہ مثلاً یہ جو آیا ہے کہ سانپ اور بچھو کاٹیں گے۔ انہوں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سچ مچ سانپ اور بچھو کاٹیں گے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسی سانپ اور بچھوؤں کے کاٹنے کی تکلیف ہوتی ہے ایسی ہی تکلیف روح کو ہوگی اس تکلیف کو تعبیر کر دیا جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان سے کہ سانپ بچھو کاٹیں گے۔

غرض وہ لوگ اس کے قائل ہوگئے کہ آخرت میں عذاب اور ثواب اس طور پر ہوگا جیسے بعض اوقات انسان پر خیال کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہاں بھی اعمال کی صورتیں ایسے طور سے نمایاں ہوں گی کہ وہ یوں سمجھے گا کہ میں باغوں میں پھر رہا ہوں، حوروں میں مشغول ہوں اور واقع میں باغ نہ ہوں گے نہ حوریں ہوں گی۔ مگر تصرف متخیلہ کا ایسا ہوگا جیسے یہاں آدمی بیٹھ کر وہم کو اپنے اوپر غالب کر لیتا ہے۔ (آثار المربع ص۴۷)

اگر کوئی آخرت کو بھی ایسا ہی سمجھنے لگے جیسے بعض فلاسفہ کا عقیدہ ہے تو یہ سراسر گمراہی ہے اور بالکل غلط عقیدہ ہے سو بعض کا رتو یہ عقیدہ ہے جو مذکور ہوا کہ عالم آخرت میں اعمال ہی بشکل درخت وغیرہ متخیل ہوں گے اور ان میں واقعیت کچھ نہ ہوگی۔

باقی جو نصوص کو مانتے ہیں ان کا یہ عقیدہ تو نہیں لیکن ان میں بعض مبتدعین جیسے معتزلہ جنت ونعمائے جنت کو فی الحال موجود نہیں مانتے۔ ان کو سرسری نظر سے کچھ تائید مل گئی اس حدیث سے

کہ جنت ایک چٹیل میدان ہے اور اس کے درخت سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہیں۔ اس حدیث سے انہیں دھوکا ہوا اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ کسی شیخ سے پڑھنا چاہیئے۔ وہ یوں سمجھے کہ جنت بھی خالی ہے اور دوزخ بھی خالی ہے ہم جیسے جیسے عمل کریں گے۔ یہ عمل ہی اس شکل سے ظہور کریں گے سو خوب سمجھ لیجئے یہ بھی غلطی ہے۔ واقع میں یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں مگر باوجود ہونے کے ہیں انہیں اعمال کے ثمرات، کیونکہ خدا تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ کون شخص کیا کیا عمل کرے گا۔ اسی کے مناسب سزا جزا کی صورت پہلے سے بنا کر اس کے وجود واقعی کی خبر دینے کے لئے یہ فرمایا اعدت للکافرین اعدت للمتقین۔ جیسے میزبان کو پہلے سے معلوم ہو کہ میرے مہمان کا مزاج علیل ہے اور وہ پہلے سے اس کے مزاج کے مناسب کھانا تیار کر کے رکھ دیوے تو وہ کھانا رکھا گیا مزاج کے مناسبت سے، یعنی سوداء یا صفراء یا بلغم کے لحاظ سے پلاؤ یا اور کوئی چیز اس کے لئے تیار کی گئی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی میزبان کو خبر ہی نہ ہو کہ میرے مہمان کا مزاج کیسا ہے۔ وہ کیا پرہیزی کھانا کھاتا ہے لیکن حق تعالیٰ جو میزبان ہیں۔ انھیں تو اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے مہمانوں کے مزاج کی کیا کیفیت ہے انہیں تو پہلے ہی سے مفصل علم ہے کہ میرا فلاں فلاں بندہ فلاں فلاں عمل کرے گا۔ بس ان اعمال کے مناسب ہی جزاؤں کو مہیا فرما رکھا ہے۔ پس "قیعان" کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ واقع میں وہ موجود ہے کیونکہ جنت کا مع نعمائے حسیہ بالفعل موجود ہونا تو منصوص ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ درجۂ حصول فی الحال میں قبل صدور اعمال بمنزلہ قیعان کے ہے اور درجہ ذات میں قیعان نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ فی نفسہٖ قیعان نہیں بلکہ جنتیوں کے حق میں قیعان ہے جیسے ایک شخص نے دس ہزار روپے اپنے خادموں کے لئے خزانہ جمع کر دیئے اور فی کام دس پیسے پچاس روپے علی قدر مراتب نامزد کر دیئے۔ پھر وہ شخص سب کو خطاب کر کے یوں کہتا ہے کہ اتنا روپیہ خزانے میں رکھا گیا ہے اگر تم خدمتیں کرو گے تو خزانہ میں سب کچھ ہے۔ ورنہ یوں سمجھو کہ بالکل خالی ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ قبل خدمتیں کرنے کے تمہارے حق میں گویا خزانہ خالی ہے جب خدمتیں کرنا شروع کر دو گے تو اب سمجھو کہ وہ پُر ہوگا واقع میں تو وہ اب بھی پُر ہے لیکن تمہارے حق میں وہ جبھی پُر سمجھا جاوے گا جب تم خدمتیں کر دو گے تو معنیٰ یہ ہیں حدیث کے کہ اعمال کے ثمرات تو پہلے سے مہیا کر دیئے گئے ہیں لیکن وہ ابھی کسی کی ملک نہیں بنائے گئے جیسے جیسے بندے عمل کرتے جاتے ہیں وہ ثمرات ان کے نامزد ہوتے جاتے ہیں۔

اب اس تقریر پر سب اشکالات رفع ہو گئے تو عالم مثال میں بھی حق تعالیٰ نے انہیں اعمال کو پہلے سے متمثل فرمایا ہے اور جنت و دوزخ میں بھی انہیں اعمال کی شکلیں پہلے سے پیدا فرما دی ہیں کیونکہ حق تعالیٰ کو تو معلوم تھا کہ میرے بندے کیا کیا اعمال کریں گے انھیں اعمال کی صورتوں کو جنت و دوزخ بنا دیا۔ (ایضاً ص۵۵ تا ۵۶)

۷۵۔ حقیقت پل صراط

حقیقت پل صراط امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ لکھی ہے کہ شریعت میں ہر چیز کا اعتدال مقصود ہے اور اعمال فروع ہیں اخلاق کی۔ تو اصل محل اعتدال کا اخلاق ہیں۔ ان کا بیان یہ ہے کہ اخلاق کے اصول تین ہیں۔ یعنی اصل میں تین قوتیں ہیں۔ جو جڑ ہیں تمام اخلاق کی۔ یعنی جن قویٰ سے اخلاق پیدا ہوتے ہیں وہ تین ہیں۔ قوتِ عقلیہ، قوتِ شہویہ، قوتِ غضبیہ۔ حاصل یہ کہ منافع کے حصول اور مضار کے رفع کے لئے خواہ وہ دنیویہ ہوں یا اخرویہ، دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک وہ قوت کہ جس سے منفعت و مضرت کو سمجھے کہ یہ مضرت یا منفعت ہے وہ قوت مدرکہ قوت عقلیہ ہے اور ایک یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو حاصل کرے۔ یہ قوت شہویہ کا کام ہے۔ اور یہ کہ مضرت کو سمجھ کر اس کو دفع کرے۔ یہ قوت دافعہ قوت غضبیہ ہے پھر ان تینوں سے مختلف اعمال صادر ہوتے ہیں۔ پھر ان اعمال کے تین درجے ہیں۔ افراط و تفریط و اعتدال۔ چنانچہ قوت عقلیہ کا افراط یہ ہے کہ اتنی بڑھے کہ وحی کو بھی نہ ملنے جیسے یونانیوں نے کیا۔ تفریط یہ ہے کہ اتنی گھٹے کہ جہل و سفہ تک اتر آئے اسی طرح قوت شہویہ کا ایک درجہ افراط ہے کہ حرام و حلال کی بھی خبر نہ رہے۔ بیوی اجنبی سب برابر ہو جائیں۔ اور ایک درجہ ہے تفریط۔ یعنی ایسے پرہیزگار بنے کہ بیوی سے بھی پرہیز کرنے لگے۔ یا ایسا زاہد ایسے حریص ہوئے کہ اپنا پرایا سب ہضم کرنے لگے۔ یا ایسے زاہد بنے کہ ضرورت کی چیزیں بھی چھوڑ دیں۔ اسی طرح قوت غضبیہ کا افراط یہ ہے کہ بالکل بھیڑیا ہی بن جاویں۔ اور تفریط یہ کہ ایسے نرم ہوئے کہ کوئی جوتے سے بھی مارے دین کو برا بھلا بھی کہے تب بھی غصہ نہ آوے۔ یہ تو افراط و تفریط تھا۔ ایک ان تینوں قوتوں کا اعتدال۔ یعنی جہاں شریعت نے اجازت دی ہو وہاں تو ان قوتوں کو استعمال کرے۔ اور جہاں اجازت نہ دی ہو وہاں ان قوتوں سے کام نہ لے۔ یہ اعتدال ہے۔ تو ہر وقت میں تین درجے ہوئے۔ افراط، تفریط، اعتدال،

ان سب درجوں کے الگ الگ نام ہیں ۔ جو قوت عقلیہ کا درجۂ افراط ہے اس کا نام ہے جزیرہ اور جو تفریط کا درجہ ہے اس کو سفاہت کہتے ہیں جو اعتدال کا درجہ ہے اس کا لقب حکمت ہے ۔ اسی طرح قوت شہویہ کا افراط کا درجہ فجور ہے ۔ تفریط کا درجہ خمود ہے اعتدال کا درجہ عفت ہے ۔ اور قوت غضبیہ کا بڑھا ہوا درجہ تہور ہے گھٹا ہوا درجہ جبن ہے ۔ اعتدال کا درجہ شجاعت ہے ۔

تو یہ نو چیزیں ہوئیں ۔ جو تمام اخلاق حسنہ وسیئہ کو جاوی ہیں اور مطلوب ان نو درجوں میں صرف تین درجے اعتدال کے ہیں ۔ یعنی حکمت ، عفت ، شجاعت ، باقی سب رذائل ہیں تو اصول اخلاق حسنہ کے یہ تین ہوتے ۔ اور ان تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہے اس لئے اس امت کا لقب وسط ہے ، یعنی امت عادلہ ، غرض انسان وہ ہے جس میں اعتدال ہو ۔ اب آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں بزرگ تو بہت ہیں ، انسان بہت کم ہیں ۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

زاہد شدی و شیخ شدی و دانشمندی ۔
ایں جملہ شدی ولیکن انسان نشدی ۔

جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب یہ سمجھئے کہ اعتدال حقیقی سب میں زیادہ مشکل ہے کیونکہ اعتدال حقیقی کہتے ہیں وسط حقیقی کو کہ اس میں ذرہ برابر نہ افراط ہو نہ تفریط ہو اور مشاہدہ سے اس کا دشوار ہونا ظاہر ہے ۔ اور پل صراط اسی اعتدال کی صورت مثالیہ ہے اور اس کی دشواری تلوار کی تیزی کی صورت میں ظاہر ہوئی اور اس کا اعتدال حقیقی بال سے زیادہ باریک ہونے کی صورت میں ظاہر ہوا کیونکہ جب اعتدال وسط حقیقی ہوگا اور وسط حقیقی غیر منقسم ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ منقسم ہو تو پھر خود اس میں طرفین اور وسط نکلیں گے ، تو وہ وسط حقیقی نہ رہا ۔ بہرحال وسط حقیقی کا غیر منقسم ہونا لازم ہے ۔ اور بال منقسم ہے تو وہ بال سے زیادہ باریک ہوگا ۔

بس اس طرح شریعت کا وسط حقیقی ہونا اس شکل سے ظاہر ہوگا کہ وہ پل صراط بال سے زیادہ باریک ہوگا ۔ اس تشبیہ میں کوئی امر خلاف اصول عقلیہ لازم نہیں آتا ۔ اور اس درجہ کے وسط ہونے سے اس کا مشکل ہونا بھی لازم آیا کہ نہ ادھر جاؤ نہ ادھر جاؤ ۔ بیچوں بیچ میں رہو ۔

بس یہ حقیقت پل صراط کی وہ شریعت کی صورت مثالیہ ہے جس کا بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہونا ثابت کر دیا گیا ۔ تو شریعت پر چلنے والے اب بھی پل صراط پر چل رہے ہیں جب یہ ہے تو جو یہاں پل صراط پر یعنی شریعت پر چل چکا ہے وہ وہاں بھی باآسانی چل سکے گا ۔ کیونکہ وہ یہی تو ہے ۔ اب بتلائیے پل صراط پر چلنا کیا دشوار ہوا جو یہاں شریعت پر چل رہا ہے اسے وہاں بھی

چلنا آسان ہو جائے گا ۔

سو پل صراط پر چلنے کا طریقہ بہت ہی آسان ہے اور وہ سنت کا طریقہ ہے ۔ یہی سنت بیچ کا راستہ ہے ۔ اسی کو فرماتے ہیں شیخ سعدیؒ ؎

مپندار سعدی کہ راہِ صفا	تواں رفت جز در پئے مصطفیٰ ۔
دریں راہ جز مرد راعی نرفت	گم آں شد کی دنیاں راعی نرفت

(آثار المربع صـ۵۹)

۷۶ ۔ عقل کے معنیٰ اور تشریح

عقل کے معنیٰ لغت میں روکنے والا ہیں ۔ اسی سے عقال رسی کو کہتے ہیں کہ وہ جانور کو بھاگنے سے روکتی ہے ۔ تو عقل کا حاصل یہ ہوا کہ وہ ایسی قوت مدرکہ ہے جو مضرت سے روکتی ہے ۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ مضرت کیا چیز ہے اور منفعت کیا چیز ہے سو اصل میں مضرت کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور منفعت کی بھی ، کیونکہ ہر منفعت میں کچھ نہ کچھ مضرت بھی ہے اور ہر مضرت میں کچھ نہ کچھ منفعت بھی ہے ۔ اب عقل کا یہ کام ہے کہ وہ یہ بتا دیتی ہے کہ کہاں منفعت کا پہلو غالب ہے اور کہاں مضرت مثلاً ایک شخص کو شدت کی پیاس لگی ہوئی ہے ۔ حلق خشک ہوا جاتا ہے ۔ دم نکلا جاتا ہے ایسے وقت میں اس کے پاس صرف دودھ ہے ۔ مگر دودھ ایسا ہے جس میں سے کچھ سانپ بھی پی گیا ہے جس کی وجہ سے زہریلا ہو گیا ہے اب بعض دوست تو یہ کہتے ہیں میاں دودھ پی بھی لو ۔ تمہارا حلق تو تر ہو جائے گا مگر پیاس تو بجھ جائے گی ۔ اور بعض کہتے ہیں اسے ہرگز نہ پینا ۔ کیونکہ اس میں زہر ہے ۔ اس وقت حلق تر ہو جائے گا ۔ مگر پھر حیات ہی منقطع ہو جائے گی ۔ اس وقت عقل یہ فیصلہ کرے گی کہ گو دودھ پی لینے میں قدرے منفعت بھی ہے مگر یہ منفعت معتدبہا نہیں ۔ اس لئے نہیں پینا چاہیئے ۔

الغرض منفعت قابل اعتبار وہ ہے جو ضرر پر غالب ہو ۔ اسی طرح ضرر وہ قابل اعتبار ہے جو نفع پر غالب ہو ۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا ۔ دوسرا مقدمہ اس کے اور ملائیے کہ دنیا کی منفعت سے آخرت کی منفعت بڑھی ہوئی ہے ۔ اور دنیا کی مضرت سے آخرت کی مضرت بڑھی ہوئی ہے ۔ دنیا کی منفعت و مضرت آخرت کی منفعت و مضرت کے آگے کوئی چیز نہیں ۔

ان دونوں مقدموں کے ملانے کے بعد عقل بھی یہی فتویٰ دے گی کہ جس کام میں دنیا کی منفعت ہو مگر آخرت کی مضرت ہو ۔ ایسی منفعت کو چھوڑ کر آخرت کی مضرت سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیئے ۔

اسی طرح کسی کام میں دنیا کی مضرت ہو اور آخرت کی منفعت ہو تو عقل کہے گی کہ چھوٹی مضرت کو بڑی منفعت کے لئے گوارہ کرنا چاہیئے۔

بس یہ ہے اصلی عقل۔ مگر آج کل لوگوں نے دنیا کمانے کا نام عقل رکھ لیا ہے۔ اگر اسی کا نام عقل ہے تو فرعون سب سے بڑا عاقل ہوگا مگر اس کا جاہل اور احمق ہونا تمام مسلمان کو مسلم ہے۔

(الامتحان ص۲)

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج بتاریخ ۳ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ بمقام موضع گنج متصل لاھور میں مواعظ کے انتخاب کا سلسلہ متعلقہ جواباتِ شبہات واعتراضات اختتام کو پہونچا۔ وللہ الحمد۔

مکتبہ تھانوی دیوبند

سہارن پور۔ یوپی۔ پن نمبر ۲۴۷۵۵۴

کتبہ منظور الحسن اعظمی